

## سترھواں باب

ایک شام معظم علی اور اس کے ساتھی گھنا جنگل عبور کرنے کے بعد اس وادی میں داخل ہو چکے تھے۔ جہاں اکبر خاں کے قبیلے کی بستیاں آباد تھیں۔ اکبر خاں کے گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی ایک ٹیلے کے اوپر سے گزرتی تھی۔ معظم علی نے ٹیلے پر پہنچ کر اپنے سامنے اچانک وحشت ناک منظر دیکھا اور اپنا گھوڑا روک لیا۔ شام کے دھندلکے میں اکبر خاں کا گاؤں آگ کا ایک بہت بڑا لالہ نظر آتا تھا۔ ایک ٹائیپ کے لیے معظم علی کی رگوں میں خون کا بہ قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ اکبر خاں کی بستی سے آگے افق پر دو اور بستیاں میں آگ کے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک لمحے کے اندر اندر وحشت برزیت اور غلامیت کے کسی منظر معظم علی کی آنکھوں کے سامنے آگئے۔ اس کے ساتھی ہتھیلی پریشانی کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا: ”وہ اکبر خاں کا گاؤں ہے۔ اب وہاں شاید دشمن کے سوا کوئی اور نہ ہو۔ تم یہیں ٹھہرو، میں اچھی آتا ہوں!“

مستم علی کے ایک ساتھی نجف خاں نے کہا: ”آپ کہ از کم ایک آدمی کو ضرور ساتھ

لے جائیں۔“  
”بہت اچھا، تم میرے ساتھ آ جاؤ۔“  
نجف خاں کے ساتھ ٹیلے سے اتر کر کوئی ایک کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد

میں اور ان کا رخ روہی کھنڈ کی طرف تھا۔ اگر آپ کا حکم ہو تو ان کے پیچھے

ساتھ دستہ روانہ کر دیا جائے!“

ادولہ نے جواب دیا: ”نہیں اب روہی کھنڈ پہنچ کر وہ ہمارے لیے کسی شے نہیں ہو سکتے۔ جنگ ایک دو دن کے اندر ختم ہو جائے گی۔ میں صرف سرگرمیوں سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔ مگر یہ آدمی چند دن پہلے آتا تو میں یقیناً لیتا۔ اب اس کا راستہ روکنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

معلم علی نے کہا: اب گھوڑوں کو آگے لے جانا ٹھیک نہیں۔ تم یہیں ٹھہراؤ اور میرا انتظار کرو۔ اگر مجھے کوئی خطرہ پیش آیا تو میں بندوق چلا کر تمہیں خبردار کر دوں گا۔ پھر اگر میں صبح تک نہ پہنچوں تو تم باقی ساتھیوں کو لے کر واپس روانہ ہو جانا۔ میرا خیال ہے کہ بستی سے باہر دوہ یا انگریزی فوج کا کوئی دستہ ٹپاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ ورنہ یہ ممکن نہیں کہ آگے خاں کے گھر میں آگ لگی ہو اور علاقے کے لوگ دیوانوں کی طرح اس طرف نہ بھاگ رہے ہوں۔

معلم علی نے اپنا گھوڑا بخت خاں کے سپرد کیا اور بھاگتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اسے گاؤں کی دوسری طرف آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گاؤں کے درمیانی حصے میں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ آگ کا ساوا زور کبر خاں کی حویلی میں ہے گاؤں سے باہر چند مقامات پر گندم کے کھلیان جل رہے تھے اور بعض کھیتوں میں بچی ہوئی گندم ابھی تک کھڑی تھی۔ معلم علی روشنی سے بچنے کے لیے گندم کے کھیتوں میں جھک جھک کر چلتا ہوا گاؤں کی دوسری طرف بڑھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے ایک وسیع میدان میں فوج کا پڑاؤ دکھائی دیا۔ گاؤں سے آگ کی روشنی دور دور پہنچ رہی تھی۔ پڑاؤ کے درمیان چند نیسے نصب تھے اور پیچھے ایک ٹیلے کے نشیب میں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ایک جگہ فوج کے لیے کھانا تیار ہو رہا تھا۔ کچھ سپاہی چھوٹی چھوٹی ٹوٹیوں میں زمین پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور باقی گاؤں کی طرف جمع ہو کر آگ کا منظر دیکھ رہے تھے۔ یہ ادھک کی فوج تھی۔

معلم علی گندم کے ایک کھیت میں رہینگا ہوا آگے بڑھا اور سپاہیوں کی ایک ٹولی کے قریب جا پہنچا۔ ادھک کے سپاہیوں کے درمیان چند انگریز کھڑے تھے اور ان کے چہرے آگ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ معلم علی ان کی باتیں سننے کے لیے قریب جانا چاہتا تھا لیکن گندم کے کھیت سے آگے کوئی چھپنے کی جگہ نہ تھی۔ سپاہیوں کے گردہ کے پاس معلم علی

کو دو توپیں دکھائی دیں۔

پہریداروں کی ایک ٹولی گشت لگاتی ہوئی کھیت کے قریب سے گزری اور معلم علی کھیت کے کنارے سے پیچھے ہٹ کر لیٹ گیا۔ ایک سپاہی اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا: اب اس علاقے کے لوگ خواب میں بھی کسی انگریز پر گولی نہیں چلائیں گے۔ دوسرے نے کہا: تم انہیں نہیں جانتے۔ ہر لوگ مرتے دم تک اپنے دشمن کو مہتا نہیں کرتے۔ تم نے ان کے سردار کو نہیں دیکھا؟ وہ رسیوں میں جکڑا ہوا بھی انگریز افسر کو گالیاں دے رہا تھا۔

تیسرے نے کہا: وہ تو اب ادھک کبھی گالیاں دے رہا تھا۔ اس کے خاندان کے لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ حملے سے پہلے یہاں سے نکل گئے تھے۔ ورنہ ان میں سے کوئی زندہ نہ بچتا۔

چوتھے نے کہا: لیکن مجھے اب بھی یقین ہے کہ جن لوگوں نے انگریزوں پر گولی چلائی تھی وہ صبح تک اپنے سردار کی جان بچانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیں گے۔ لیکن اگر انہوں نے اپنے آپ کو پیش نہ کیا تو؟

تو کل اسے پھانسی دے دی جائے گی اور پھر اس قوم کی ہرستی کا یہی حال ہوگا۔ لیکن یہ ظلم ہے!

ظلم کیا ہے یہ لوگ اپنی تباہی کے خود ذمہ دار ہیں!

پہرے دار دور چلے گئے اور معلم علی اسی طرح رہینگا ہوا واپس لوٹا اور تھوڑی دیر بعد وہ کھیت سے نکل کر بھاگ رہا تھا۔



معلم علی نے پک ڈنڈی پر پہنچ کر ادھک دیکھا لیکن بخت خاں اسے کہیں نظر نہ آیا۔ بخت خاں بخت خاں!! اس نے دبی زبان سے آوازیں دیں اور پھر کسی طرف سے

اکبر خاں کے خاندان کے لوگوں کا حال پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت اس کی والدہ، بیوی اور بچے کہاں ہیں؟

ایک آدمی نے سستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: اکبر خاں کی والدہ اور اس کے خاندان کے کئی افراد کی لاشیں اس مکان کے اندر چل رہی ہیں لیکن تم نے اکبر خاں کے متعلق کیوں نہیں پوچھا؟

”اکبر خاں کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ اس وقت دشمن کی قید میں ہے۔ خدا کے لیے آپ اس کی بیوی اور بچوں کے متعلق بتائیے؟“

اس کی بیوی اور بچے سلامت ہیں لیکن تمہارا ساتھی یہ کہتا تھا کہ تم لوگ لکھنؤ کے راستے میسور سے آ رہے ہو، پھر تمہیں اکبر خاں کے متعلق یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ قید میں ہے؟

معظم علی نے جواب دیا: میں ابھی دشمن کی فوج کا پلاؤ دیکھ کر آ رہا ہوں لیکن میں تمہاری تسلی نہیں کر سکتا۔ خدا کے لیے مجھے ذرا اکبر خاں کی بیوی کے پاس لے چلو وہ مجھے جانتی ہے۔“

”چلو!“

کھیتوں سے آگے قریباً دو میل گھنے جنگل میں چلنے کے بعد یہ لوگ ایک جگہ کے جنگل کے پیر میروں میں سے کسی نے درختوں کی اوٹ سے آواز دی: کون ہے؟

معظم علی کے ایک ساتھی نے جواب دیا: میں نعمت خاں ہوں، ہم نے چند قیدی بھیجے تھے وہ پہنچ گئے ہیں؟

پھر میرا نے جواب دیا: وہ پہنچ گئے ہیں لیکن آپ سے بڑی غلطی ہوئی وہ قیدی نہیں ہیں، ان کا ایک ساتھی پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ کہاں ہے؟

وہ ہمارے ساتھ ہے۔“

جواب نہ پا کر اس نے سوچا شاید میں تاریکی میں راستہ بھول کر کسی اور جگہ آ گیا ہوں۔ وہ پریشان اور تذبذب کی حالت میں پگ ڈبڑی پر کھڑا تھا۔ اچانک اسے کسی کی آواز سنائی دی۔ ”اپنے ہتھیار پھینک دو تم ہماری بندوقوں کی زد میں ہو!“

معظم علی نے اطمینان سے جواب دیا: اگر تم انگریز یا ادھ کی فوج کے سپاہی نہیں ہو تو مجھے اپنا دوست سمجھو۔“

”تم اپنے ہتھیار پھینک دو ہم کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے۔“

معظم علی نے اپنی بندوق پھینک کر دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا: اگر تم اکبر خاں کے ساتھی ہو تو اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔

پانچ آدمی بندوقیں میٹھی کیے کھیت کی مینڈ کی آٹسے نمودار ہوئے اور انھوں نے آگے بڑھ کر معظم علی کو گھیرے میں لے لیا۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اس کی بندوق اٹھالی۔

معظم علی نے کہا: میں اکبر خاں کا دوست ہوں اور آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میرا ساتھی کہاں ہے؟

ایک آدمی نے کہا: اکبر خاں کے دوست اس طرح مسلح ہو کر رات کو اس علاقے میں نہیں آتے۔ تمہارا ساتھی اگر یہیں تھا تو وہ ہماری قید میں ہے اور اگر جنگل کے قریب ٹیلے پر بھی تم ہی اپنے چار اور ساتھیوں کو چھوڑ آئے تھے تو وہ بھی ہماری قید میں ہیں۔

معظم علی نے کہا: میرا نام معظم علی ہے اور اگر تم میں سے کوئی شخص اکبر کے گارڈ کا ہے تو میں اس پر یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ میں اکبر خاں کا دوست ہوں۔

”ہم روہیلکھنڈ کے لوگوں کے سوا کسی کو اکبر خاں کا دوست نہیں سمجھتے تمہارا ساتھ چلو۔“

میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس سے پہلے میں آپ سے

تسکت خوردہ آدمیوں کو ایک رہنما کی ضرورت تھی۔ قدرت نے ہماری مدد کے لیے آپ کو بھیج دیا ہے۔ یہاں کم از کم دوسو آدمی ایسے ہیں جو پانی پیت کی جنگ میں آپ کے ساتھ تھے۔ اگر آپ ہماری رہنمائی کریں تو ایک ہزار آدمی آپ کے ساتھ جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم اکبر خاں کو دشمن کی قید میں چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتے! معظّم علی نے کہا۔ "تم فوراً تمام آدمیوں کو جمع کرو۔ ہم آدھی رات کے وقت یہاں سے روانہ ہوں گے۔"

چند منٹ کے اندر اندر جنگ کے طول و عرض میں پانی پیت کے آلودہ کار سپاہی کی آمد کی خبر مشہور ہو چکی تھی اور بوڑھے جان اور فوجیوں کے معظّم علی کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ ان میں بعض وہ بھی تھے۔ جو تیرہ سال قبل پانی پیت کے میدان میں معظّم علی کے دوش بدوش داد شجاعت دے چکے تھے۔ معظّم علی انھیں مزدوری ہدایات دینے کے بعد ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے رو سکینٹڈ کی جنگ اور سستی پر حملے کی تفصیلات سن رہا تھا۔

اکبر خاں کے گاؤں کے ایک آدمی نے اسے بتایا کہ اودھ اور انگریزوں کی افواج نے مختلف مقامات سے رو سکینٹڈ میں داخل ہو کر میراں پور کھڑے کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ اکبر خاں اپنے علاقے کے ایک ہزار جوانوں کو لے کر حافظ رحمت خاں کی مدد کے لیے روانہ ہوا۔ اس کی روانگی کے دو دن بعد اودھ سے ملک کے چند دستے اس علاقے میں داخل ہوئے۔ ہمارے پاس بسیوں کی حفاظت کے لیے زیادہ آدمی نہ تھے۔ اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر دشمن ہماری بسیوں میں داخل نہ ہو تو ہم کوئی مزاحمت نہ کریں لیکن اودھ کی فوج اس علاقے کے لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے ارادے سے ہمارے گاؤں میں داخل ہوگئی۔ ان کے ساتھ پانچ انگریز افسر تھے۔ گاؤں کے لوگ سرسیم ہو کر سردار اکبر خاں کی تحویل میں بت ہو گئے۔ اودھ کے کمانڈر نے ہم سے مطالبہ کیا کہ اگر گاؤں کے لوگ اپنا اسلحہ ہمارے

اسے آگے لے چلو!"  
تاریک اور گھنے جنگل میں تھوڑی دور اور چلنے کے بعد معظّم علی کو ایک جگہ روشنی دکھائی دی۔ ایک آدمی مشعل بلند کیے گھنے درختوں کی آڑ سے نمودار ہوا اور معظّم علی کے قریب پہنچ کر بولا۔ "آپ معظّم علی ہیں؟"  
"ہاں! اس نے جواب دیا۔

"معائنہ کیجئے ہمارے آدمیوں سے بڑی بھول ہوئی!"  
معظّم علی نے جواب دیا: "آپ کے ساتھیوں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اکبر خاں کی بیوی اور بچے کہاں ہیں؟"  
قریب سے آہوں، سسکیوں اور چیخوں میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ "بھائی جان! میں یہاں ہوں!"

اور ایک تانیر بعد بقیس تاریکی سے نکل کر معظّم علی کے سامنے کھڑی تھی۔ معظّم علی نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ اس کے سر پر رکھے ہوئے کہا: "بھئیس اب باتوں کا وقت نہیں بھائیو! میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ اس جنگل میں کتنے آدمی ہیں جو ہتھیار اٹھا سکتے ہیں؟" ایک آدمی نے جواب دیا: "اس جنگل میں آس پاس کی تمام آبادی جمع ہو چکی ہے لیکن جوڑنے والے تھے، ان میں سے کچھ تو میراں پور کنڑہ کی جنگ میں کام آچکے ہیں اور کچھ ہمارے گاؤں کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں صبح تک انگریز اور اودھ کے سپاہی ہمیں بھی اس جنگل میں گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیں گے!"

معظّم علی نے جواب دیا: "اگر تین چار سو آدمی اس وقت اپنی جانوں پر کھیننے کے لیے تیار ہو جائیں تو ایسی صبح کبھی نہیں آئے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ دشمن کے پڑاؤ میں چار پانچ سو آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوں گے۔"

ایک آدمی آگے بڑھ کر بے اختیار معظّم علی کے ساتھ لپٹ گیا اور اس نے کہا: "ان

حوالے کر دیں اور ہمیں سردار کے مکان کی تلاش کرنے دین تو ان پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔ دشمن کو یقین تھا کہ ہم اس کی دھمکی سے مرعوب ہو جائیں گے لیکن ہم نے یہ جواب دیا کہ اکبر خاں کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے تمہیں ہماری لاشوں پر سے گزرنا پڑے گا۔ ایک انگریز نے شیخی میں آکر حویلی کے دروازے پر ہوائی قنارہ کر دیا۔ اس کے جواب میں ہم نے گولیاں چلائیں اور پلک پلک کی دیر میں دس بندرہ آدمی دہیں ڈھیر ہو گئے۔ ہلاک ہونے والے میں دو انگریز تھے۔ ایک انگریز نے زخمی ہو کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اودھ کے سپاہیوں کے لیے یہ صورتِ حالات غیر متوقع تھی اودھ بھاگ نکلے۔ ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد رہتی لیکن ہم نے تعاقب کرنا مناسب نہ سمجھا۔

پھر میں میراں پور کٹھہ کے میدان میں اپنی شکست اور حافظہ رحمت خاں کی شہادت کی اطلاع ملی۔ ہمارے علاقے کے چار سو نوجوان شہید ہوئے اور باقی اکبر خاں کے ساتھ واپس آ گئے۔

تین دن بعد میں یہ معلوم ہوا کہ اودھ کی فوج کے کچھ دستے چند انگریز سپاہیوں کے ساتھ اس گاؤں کا رخ کر رہے ہیں۔ سردار نے راتوں رات گاؤں کی عورتوں اور بچوں کو جنگل کی طرف بھیج دیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ اس فوج کی رہنمائی وہی انگریز افسر کر رہا ہے جو یہاں سے زخمی ہو کر بھاگا تھا۔ اس نے سردار اکبر خاں کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر تم انگریز افسروں کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کر دو تو بہتر در نہ تھا ہمارے مکان کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا جائے گا۔

لڑائی شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے تین بار حویلی پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار انہیں ہماری گولوں کی بارش میں پھینا ہٹنا پڑا۔

اگلے دن ان کی دو تہیں پیچ نکلیں اور انہوں نے گاؤں پر گولہ باری شروع کر دی۔ تیسرے پر تک گاؤں جلنے کا ایک ڈھیر بن چکا تھا۔ اکبر خاں کے تین چچا زاد اور دو دوسرے زاد بھائی مارے جا چکے تھے۔ ان کی والدہ جو خاندان کی دوسری عورتوں کے ساتھ

جلانے کی بجائے اپنے بیٹے کے ساتھ رہنے پر مصر تھیں، زخمیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہو گئیں۔ اکبر خاں کی حویلی کے محافظوں کو باہر سے دشمن محاصرے میں لیے ہوئے تھا اور حویلی کے اندر وہ بڑی تیزی سے آگ کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ چند گھنٹے حویلی کے اندر ہی رہے ہوئے تھے لیکن سردار کے ساتھیوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ اس نے ہم میں سے بہترین نیزہ بازوں کو گھوڑوں پر سوار ہو جانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد حویلی کا دروازہ کھولا گیا اور سردار نے سواروں کے ساتھ نکل کر گاؤں کے جنوب کی طرف دشمن کی صفوں پر حملہ کر دیا۔ اس کے پیچھے باقی آدمی بھی نکل آئے۔ دشمن کی گولوں سے چار سوار شہید ہو گئے۔ اکبر خاں کے گھوڑے کو گولی لگی اور وہ گر پڑا۔ میرے ساتھ پندرہ آدمیوں نے مر کر اسے بچانے کی کوشش کی لیکن وہ بیہوش پڑا ہوا تھا۔ ہرنے اکبر خاں کو اس حال میں چھوڑ کر بھاگنا گوارا نہ کیا اور اپنے ہتھیار چھینک دیئے۔ دشمن نے ہمیں گرفتار کر لیا۔ باقی آدمیوں میں سے چند زخمی اور شہید ہو گئے اور باقی لڑتے بھرتے نکل گئے۔ اکبر خاں کو تھوڑی دیر بعد ہوش آ گیا اور انگریز افسر نے اس سے کہا کہ اگر تم اپنے قبیلے کے تمام آدمیوں کو یہاں جمع کر کے ہماری وفاداری کا یقین دلاؤ اور ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر دو۔ جنہوں نے دوا انگریز افسروں کو ہلاک کر دیا تھا تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ در نہ کل تمہیں پھانسی دے دی جائے گی۔ اکبر خاں نے جواب دیا: "تم مجھے قتل کر سکتے ہو لیکن ذلیل نہیں بنا سکتے۔" میں نے انگریز افسر سے کہا: "اگر آپ مجھے چھوڑ دیں تو میں کل تک اس علاقے کے تمام چیدہ چیدہ آدمیوں کو یہاں حاضر کرنے کا ذمہ لیتا ہوں اور میں اس بات کا ذمہ بھی لیتا ہوں کہ انگریز افسروں کے قاتلوں کو آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ انہوں نے مجھے رہا کرتے وقت یہ دھمکی دی کہ اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو اکبر خاں کے ساتھ تمہارے باقی ساتھیوں کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ اکبر خاں نے مجھے غلامی اور بزدلی کے طعنے دیتے۔ کاش میں اس کے کان میں اتنا کہہ سکتا کہ میں یہ سب کچھ تمہارے لیے کر رہا ہوں۔"

وہ اٹے پاؤں پیچھے ہٹے۔ اس کے ساتھ ہی تقریباً دو سو آدمیوں نے جو تلواروں اور نیزوں سے مسلح تھے، اکھیت سے نکل کر ان پر ہڑ بول دیا۔ بعض سپاہیوں نے عقب کے ٹیلے کی طرف سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن حملہ آور ٹیلے کے نشیب پر سب قابض ہو چکے تھے۔ اکبر خاں اور اس کے ساتھی قیدی کی حالت میں پڑاؤ کے درمیان اگریز سپاہیوں کے خمیوں سے کچھ دور پڑے ہوئے تھے اور اودھ کے جو سپاہی ان کی حفاظت پر متعین تھے انتہائی اضطراب کی حالت میں ان سے پوچھ رہے تھے: "یہ کون ہیں۔ یہ کہاں سے لائے ہیں۔ یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

اکبر خاں نے جواب دیا: "تھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی دیر بعد تمہیں یہ معلوم نہیں رہے گا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔"

اودھ کی فرج کا ایک افسر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے پہریلوں سے پوچھا: "قیدی کہاں ہیں؟"

"قیدی یہیں ہیں۔ ایک پہریلو نے جواب دیا: ان کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے؟"

افسر جواب دینے کی بجائے آگے بڑھا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قیدیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "سر دار اکبر خاں! اس حملے کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ ہمارے سالار اور اگریز افسروں نے تمہیں ذرا قتل کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

اکبر خاں نے اطمینان سے جواب دیا: "مجھے قتل کر کے تم اپنی جانیں نہیں بچا سکتے۔"

"لیکن اگر تم یہ قتل عام بند کرانے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں آزاد کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

اکبر خاں نے جواب دیا: "میں تمہارے ساتھ کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔"

افسر نے جلدی سے اپنا خنجر نکال کر اکبر خاں کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کاٹتے ہوئے

آپ کی آمد سے پہلے میں رات کے وقت دشمن کے پڑاؤ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر چکا تھا اور کوئی تین سو آدمی میرا ساتھ دینے کے لیے آمادہ بھی ہو گئے تھے لیکن اپنی کامیابی بے مددغوش نظر آئی تھی۔ اب مجھے یقین ہے کہ قدرت نے آپ کو بلاوجہ نہیں بھیجا ہے۔ آپ کی آمد سے پہلے جب میں نے ان سے درخواست کی تھی تو ان میں سے بہت سے لوگ یہ کہتے تھے کہ ہم اپنی عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر کہاں جائیں لیکن اب ان کی عورتیں اور بچے بھی آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

ایک کس نے بچے نے مسطعلی کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

مسطعلی نے اسے اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے پوچھا: "میرا تمہارا نام کیا ہے؟"

"شہباز۔" اس نے جواب دیا۔

پچھے سے بلقیس کی آواز آئی: "شہباز یہ تمہارے چچا جان ہیں؟"



اودھ کے سپاہی اور ان کے اگریز ساتھی رات کے دو بجے پہریلوں کی پیچ و پلک بندو قوں کی آوازیں اور حملہ آوروں کے نعرے سن کر بیدار ہوئے۔ ان کی آن میں پڑاؤ کے اندر اترتاری پھیل گئی۔ حملہ آور تین اطراف سے پڑاؤ میں داخل ہو کر قتل عام شروع کر چکے تھے۔ تاریکی میں اودھ کے سپاہی یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ سپیکٹروم کی ساری آبادی ان کے پڑاؤ پر حملہ کر چکی ہے۔ افسروں میں سے کوئی صفیں درست کرنے اور کوئی اپنے سپاہیوں کو بھاگنے کا حکم دے رہا تھا۔ سرایتی کی حالت میں اودھ کے کسی سپاہی اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ انھیں جنوب مشرق کے سوا ہر سمت حملہ آوروں کا سیلاب نظر آ رہا تھا۔ بیشتر سپاہی اس طرف بھاگ نکلے۔

تھوڑی دیر میں جنوب مشرق کی طرف ایک عام سپاہی شروع ہو چکی تھی لیکن کوئی دو فرلانگ دور بھاگنے والوں کو کھیتوں کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑا اور

کہا: مجھے ایک بہادر دشمن سے کوئی وعدہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا: "ان سب قیدیوں کو آزاد کر دو۔ جلدی کرو!"

سپاہیوں نے قیدیوں کی ریتیاں کاٹنی شروع کر دیں۔  
اکبر خاں نے اٹھتے ہوئے کہا: "تم اپنے ہتھیار ہمارے حوالہ کر دو اور اسی جگہ بیٹھے رہو!"

نوجوان افسر نے کہا: "اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ آپ اودھ کے سپاہیوں کو امان دیں گے تو ہم اپنے ہتھیار آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔"  
اکبر خاں نے جواب دیا: "میں لڑائی ختم ہونے سے پہلے کوئی وعدہ نہیں کرتا۔"  
افسر نے اپنی تواریخ نکال کر اکبر خاں کو پیش کر دی اور باقی پہرہ داروں نے بھی اپنے اپنے ہتھیار قیدیوں کے سامنے پھینک دیئے۔

قیدی ایسی تواریخ اور بندوقیں اٹھا رہے تھے کہ ایک طرف سے آواز آئی۔  
"قیدی کہاں ہیں؟"

"قیدی یہاں ہیں۔ اکبر خاں نے جواب دیا۔"

نوجوان افسر نے دبی زبان میں کہا: "یہ ہمارے کمانڈر ہیں۔"

کمانڈر پانچ اور سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھا اور اس نے کہا: "اکبر خاں کے سوا باقی تمام قیدیوں کو مار دو اور ان سے کہو کہ اگر دس منٹ کے اندر انڈر اٹھوں نے حملہ آوروں کو واپس جانے پر آمادہ نہ کیا تو اکبر خاں کی گردن مار دی جائے گی۔"

اکبر خاں نے اچانک بڑھ کر حملہ کیا اور کمانڈر ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ کمانڈر کے ساتھیوں نے بھی اپنی برحوائی پر قابو نہیں پایا تھا کہ اکبر خاں نے دوسرے دار میں ایک اور آدمی کو مار گرایا۔ باقی قیدی دوسرے آدمیوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کی آن میں انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس عرصہ میں پڑاؤ پر حملہ آور دل کا گھبراہٹ سے تنگ

ہو چکا تھا۔ تاہم وہ تاریکی میں غیر ضروری نقصان سے بچنے کے لیے دشمن کے ساتھ لگے گئے۔ ہرنے کی بجائے اکا دکا حملوں پر اکتفا کر رہے تھے۔ حملہ آوروں کی ایک ٹوٹی ایک شدید حملے کے بعد انگریزوں کے خیموں کے قریب پہنچ چکی تھی۔

اکبر خاں اس افسر کی طرف متوجہ ہوا جس نے قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے کہا: "اب تم ہمارے ساتھی ہو۔ میں ایک افسر کو اس کے اپنے سپاہیوں کے خلاف لڑنے کے لیے نہیں کہوں گا لیکن تم انھیں ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دے کر بہت سے آدمیوں کی جانیں بچا سکتے ہو۔"

افسر بھاگ کر آگے بڑھا اور چاروں طرف سے سختی ہوئی فوج کے درمیان کھڑا ہو کر بلند آواز میں چلانے لگا۔ "کمانڈر مارا گیا۔ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہتھیار ڈال دو!"

تھوڑی دیر میں اودھ کے سپاہی اس کا یہ پیغام ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پہنچا چکے تھے۔ انگریز سپاہیوں کے خیموں کے آس پاس ابھی تک شدید لڑائی ہو رہی تھی۔ اکبر خاں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس طرف بڑھا اور اس نے پیچھے ہٹنے والے سپاہیوں پر عقب سے حملہ کر دیا۔ چند آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ اپنا راستہ صاف کرتا ہوا حملہ آوروں سے جا ملا اور بلند آواز میں چلایا:

"میں اکبر خاں ہوں!"

اکبر خاں کے ایک رشتہ دار نے آگے بڑھ کر کہا: "اکبر خاں تم کہاں تھے؟ ہم تمہیں سارے پڑاؤ میں تلاش کر چکے ہیں۔"

اکبر خاں نے کہا: "تمہارے کسی سوال کا جواب دینے سے پہلے میں یہ جانا چاہتا ہوں کہ اس حملے کی رہنمائی کون کر رہا ہے؟"

کوئی تاریکی میں آگے بڑھا اور اکبر خاں سے لیٹ کر بولا: "بھلا بتاؤ میں کون ہوں؟"

اکبر خاں نے کہا: "اگر آپ معظم علیٰ میں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں اپنی زندگی کی بھینک رات میں ایک اور عجیب سہنا دیکھ رہا ہوں۔"

طرائی قریباً ختم ہو چکی تھی اور بقیہ السیف سپاہی جگہ جگہ پھیلا ہوا تھا۔ معظم علیٰ نے تمام قیدیوں کو ایک جگہ جمع کرنے اور مشغول جلانے کا حکم دیا۔ حملہ آوروں کے بیس آدمی زخمی اور سات ہلاک ہوئے تھے اس کے مقابلے میں اودھ کی فوج کے اسی آدمی ہلاک اور کوئی ڈیڑھ سو زخمی ہو چکے تھے۔ اودھ کی یہ فوج پانچ سو سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ ہلاک ہونے والوں کے علاوہ ان تیس چالیس آدمیوں کے سوا جو تارکی میں موقع پا کر ادھر ادھر بھاگ گئے تھے۔ باقی سب حملہ آوروں کی قید میں تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں پانچ انگریز بھی تھے اور باقی دس انگریز جن میں وہ لیفٹیننٹ بھی تھا چلنے دوں تھیں کی موت پاس گاؤں کو سزا دینے کی نیت سے آیا تھا، تہہ ہو چکے تھے۔

معظم علیٰ نے اکبر خاں سے کہا: "یہاں میرے حصے کا کام ختم ہو چکا ہے موجودہ حالات میں تمہارے قبیلے کے لوگ یہاں نہیں رہ سکتے۔ میں بہت جلد یہاں سے دور نکل جانا چاہیے۔ ان قیدیوں کے متعلق فیصلہ کرنا اب تمہارا یا تمہارے قبیلے کے لوگوں کا کام ہے۔"

اکبر خاں نے کہا: "اودھ کے سپاہیوں کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ انگریز میرے حوالے کر دیتے جائیں۔"

"تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا اور آپ سے یہ درخواست کر دوں گا کہ آپ ان کے متعلق کوئی سفارش نہ کریں۔"

معظم علیٰ نے جواب دیا: "اگر میں انہیں جنگی قیدی سمجھتا تو یقیناً ان کے ساتھ آئی

سلوک کا مطالبہ کرتا جو جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن میں ان بیڑوں کو انسان سمجھنے کی غلطی نہیں کروں گا۔ تمہیں ان پر عمل اختیار ہے۔"

اکبر خاں کے حکم سے اس کے آدمیوں نے لیفٹیننٹ ادراک کے ساتھ دوسرے انگریزوں کو پکڑ کر باقی قیدیوں سے الگ کر لیا۔ پھر چند آدمیوں نے خیموں کے دے کاٹ کر ان کی گردنوں میں ڈال دیئے۔ اکبر خاں کے ساتھ چند آدمی انگریزوں کو گھیرے میں لے کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

انگریز لیفٹیننٹ چٹلیا: ہماری فوج جلد یہاں آئے گی اور اگر تم نے ہمارے ساتھ زیادتی کی تو وہ تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ایک فوجیوں نے بڑھ کر اپنی توار کی ڈک اس کی گردن پر رکھ دی اور وہ خاموش ہو گیا۔

اکبر خاں نے کہا: "میں معلوم ہے کہ تمہاری فوج ضرور آئے گی لیکن وہ صرف ہماری بے بسی کا تماشا ہی نہیں دیکھے گی۔"

دوسرا انگریز بولا: "سردار صاحب! اگر آپ ہمیں چھوڑ دیں تو ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ انگریز اس علاقے پر کوئی زیادتی نہیں کریں گے۔"

اکبر خاں نے جواب دیا: "میں تم لوگوں کے وعدوں کی حقیقت سے واقف ہوں۔ لیفٹیننٹ نے چند قدم اور چلنے کے بعد کہا: "آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟"

اکبر خاں نے جواب دیا: "میں حیران ہوں کہ تم اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہو۔"

کوئی آدھ گھنٹہ بعد اکبر خاں کے مکان کے سامنے آگ کے ایک درخت کی مضبوط شاخوں کے ساتھ دس آدمیوں کی لاشیں ننگ رہی تھیں اور وہ دروازے کے سامنے کھڑے اس آگ کے انکاروں کو دیکھ رہا تھا جو اس کی زندگی کی بیشتر راحتوں اور سرتوں



کو بھسم کر چکے تھے۔

ایک طرف سے حویلی کی دیوار توپوں کی گولباری کے باعث ٹوٹی ہوئی تھی۔ اکبر خاں اور اس کے ساتھی اس کی طرف سے اندر داخل ہوئے۔ صحن میں بکر بگڑ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اکبر خاں کے ساتھی لاشیں اٹھا کر باہر نکل آئے اور وہ کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا اس کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں بلے کے ڈھیر سے اب تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کمرے میں اس کی ماں کی لاش دفن تھی۔

اکبر خاں! اکبر خاں! اس کے کسی ساتھی نے آواز دی اور وہ حویلی سے

باہر نکل آیا۔

جب صبح کے آثار نمودار ہو چکے تھے تو رو بیٹے پڑاؤ میں اپنے ساتھیوں کی لاشیں دفن کرنے میں مصروف تھے۔ اور وہ کی فوج کا نوجوان افسر جس نے رات اکبر خاں کو قید سے آزاد کیا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر بلائے آپ نے ہمارے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟ میں یہ اس لیے نہیں پوچھتا کہ مجھے اپنی زندگی بہت عزیز ہے۔ میں اس دن مرجھا تھا جب میراں پور کٹڑہ کے میدان میں میری تلوار ایک بے گناہ مسلمان کے خون میں آلودہ ہوئی تھی۔ ضمیر کی موت کے بعد جبر کی موت کوئی حقیقت نہیں رکھتی لیکن ان لوگوں میں اکثر ایسے ہی جنہم، شامدیہ، معلوم نہ ہو کہ اس ملک کے مسلمانوں کے لیے رو سکینڈ کے حریت پسندوں کی تباہی کیا نتائج پیدا کرے گی۔ یہ لوگ جنگ میں اس لیے شریک ہوئے تھے کہ اللہ میں پیدا ہونے سے اور اللہ کی فوج میں ملازم تھے۔ اگر وہ رو سکینڈ میں پیدا ہوئے ہوتے تو یہ حافظ رحمت خاں کی طرف سے لڑتے۔ میں نیکی بدی کا شعور رکھتا تھا لیکن میرا ضمیر شاید اس لیے مرجھا ہے کہ میں ایک بے ضمیر حکمران کے ساتھ اپنی زندگی والبتہ کر چکا ہوں۔ تاہم میری سزا ان لوگوں کی نسبت زیادہ ہونی چاہیے۔

اکبر خاں نے معظ علی کی طرف دیکھی اور معظ علی نے نوجوان کی طرف چند ثانیے غور

سے دیکھنے کے بعد پوچھا۔ "تھارا نام کیا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "میرا نام عبداللہ ہے۔"

معظ علی نے کہا: پانی پت کی جنگ میں اور وہ کی فوج کا ایک سالار ہمارے ساتھ تھا۔ اس کی شکل بالکل تم جیسی تھی۔ شاید اس کا نام محمد عمر تھا۔ جب ہم دشمن کا تعاقب کر رہے تھے تو وہ ہمارے ساتھ تھا اور اس نے بڑی بہادری سے جان دی تھی۔"

عبداللہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا: "وہ میرا باپ تھا۔"

اکبر خاں نے معظ علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے مجھے اپنی فوج کے کمانڈر کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا تھا۔"

معظ علی نے کہا: "عبداللہ! اگر تم محمد عمر کے بیٹے ہو تو مجھے اپنا دوست سمجھو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کم از کم دو دن ان سپاہیوں کو اسی علاقے میں ٹھہرانے کی کوشش کرو۔ اس عرصہ میں ہماری عورتوں اور بچوں کو یہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے بعد تم کھنڈیہ خیر بیچ سکتے ہو کہ اس علاقے کی بستیاں خالی ہو چکی ہیں۔"

عبداللہ نے جواب دیا: "مجھے کھنڈیہ اطلاع بھیجے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ میں واپس نہیں جاؤں گا لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے جو آدمی رات کے وقت بھاگ بھگے ہیں ان میں سے بعض کھنڈیہ ضرور پہنچ جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کھنڈیہ کارخ کرنے کی بجائے میراں پور کٹڑہ کے پڑاؤ میں پہنچ جائیں اور وہاں سے فوج کے چند دستے اس طرف روانہ ہو جائیں۔"

اس صورت میں بھی تمہارے لیے ان کی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنا مشکل نہ ہوگا۔

بہر صورت یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں یہاں سے زخمیوں، عورتوں اور بچوں کو نکلانے کے لیے دو دن مل جائیں۔

عبداللہ نے کہا: "میں یہ کوشش کروں گا کہ آپ کو دو دن کی بجائے دو ہفتے مل جائیں۔"

حملہ آوروں کا راستہ صاف کر دیا ہے جو مغلوں کی سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کی عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ کاش تم سب انگریز ہوتے اور ہم ضمیر کی ملامت محسوس کیے بغیر تم سب کو اسی درخت سے لٹکا کر پھانسی دے سکتے جہاں تمہارے انگریز سرسبزوں کی لاشیں لٹک رہی ہیں لیکن یہ لوگ جن کے گھر تم نے راکھ کے ڈھیر بنا دیئے ہیں، انتہائی غمزد غصہ کی حالت میں بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ تم مسلمان ہو۔ تم نے چند گھنوں کے لیے ان کی عزت اور آزادی پر حملہ کرتے وقت یہ نہیں سوچا کہ جو لوگ تمہارے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں وہ مسلمان ماؤں کے بیٹے، مسلمان بیویوں کے شوہر، مسلمان بہنوں کے بھائی اور مسلمان بچوں کے باپ ہیں۔ تمہارے دشمن یہ لوگ نہیں جنہوں نے پانی پت کے میدان میں اپنی جانوں پر کھیل کر تمہیں مرہٹوں کی غلامی سے بچایا تھا۔ بلکہ تمہارا دشمن وہ کوتا انڈیش اور ملت فروش حکمران ہے جو انگریزوں کے ساتھ تمہاری اور تمہارے بعد آنے والی نسلیں کی عزت اور آزادی کا سودا کر چکا ہے۔ ہم سب جانتے کر دہیکھنڈ میں قیامت آچکی ہے لیکن میں تمہیں اس دن سے خبردار کرتا ہوں جب تم اس سے بدتر قیامت کے اثرات لکھنؤ کی گلیوں میں دیکھو گے۔

تم آزاد ہو اور تمہیں اس لیے آزاد کیا جاتا ہے کہ تم تمہیں اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچنے کا موقع دینا چاہتے ہیں ہم تمہیں اس بات کا موقع دینا چاہتے ہیں کہ تم ان ملت فروشوں سے نجات حاصل کر سکو۔ جنہوں نے ان بازوؤں کو کاٹا ہے جو خطرے کے دقت تمہاری مدافعت کے لیے اٹھ سکتے تھے اور ان گھروں کو جلایا ہے جو تمہارے دفاعی حصار بن سکتے تھے؟

جنگ ختم ہوتے ہی ایک سوار جنگل میں چھپے ہوئے لوگوں کو فوج کی خوشخبری دینے کے لیے دروازہ ہوجکا تھا۔ اکبر خاں اور اس کے ساتھی وہاں پہنچے تو چار ہزار عورتیں، بچے

لیکن اس کے بعد میری منزل لکھنؤ نہیں ہوگی۔ شاید میرے کئی اور ساتھی بھی لکھنؤ جانا پسند نہ کریں۔

مغز علی نے کہا: میں ان سب کو سرنگاپٹیم آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میرا نام مسلم علی ہے اور تم مجھے سرنگاپٹیم میں آسانی سے تلاش کر سکو گے۔ اکبر خاں! تم گھوڑے تیار کرو، اور ان کا تمام اہل اپنے ساتھیوں میں بانٹ دو۔ صرف عبداللہ کے ہتھیار اور گھوڑا اسے واپس دے دو!

عبداللہ نے کہا: نہیں، اس وقت آپ کو ان چیزوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ بہت اچھا! لیکن جانے سے پہلے میں تمہارے ساتھیوں سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ مغز علی یہ کہہ کر قیدیوں کی طرف بڑھا اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولا: تم کسی جرم کے مستحق نہیں ہو۔ تمہارے ہاتھ ان بے گناہوں کے خون سے رنگین ہیں جن کا گناہ صرف یہ تھا کہ ان کے پاس اودھ کے سٹاک بے حس اور عیاش حکمران کے خزانے بھرنے کے لیے روپیہ نہ تھا۔ تمہارے حکمران نے رو سیکھنڈ کے حریت پسندوں کا گلا گھونٹنے کے لیے چائیں لاکھ روپے کے عوض، انگریزوں کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انگریز یہاں اس لیے نہیں آئے تھے کہ وہ تمہارے یا اودھ کے حکمران کے دوست تھے۔ نواب شجاع الدولہ نے انہیں وہی کی طرف چند اور منزلیں طے کرنے کا موقع دیا ہے اور انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر ہٹے یا تمہارا کوئی اور دشمن اودھ کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے انہی انگریزوں کو چائیں لاکھ سے نیا روپیہ پیش کر دے تو تمہارا کیا انجام ہوگا؟ شجاع الدولہ کا خیال ہے کہ اس نے انگریزوں کی اعانت سے اپنی سلطنت کی محدود وسیع کر لی ہیں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ وہ تباہی اور بربادی کے سیلاب کو بنگال سے لکھنؤ تک لے آیا ہے۔ رو سیکھنڈ شمال ہندوستان کا ایک مضبوط ترین قلعہ تھا اور اودھ کے حکمران نے یہ قلعہ توڑ کر ان بیرونی

آہوں کے سوا کچھ نہیں رہا۔ کاش الفاظ ان بہنوں اور ماؤں کی تسلی کے لیے کافی ہوتے جن کے بھائی، شوہر اور بیٹے اپنے وطن کی حفاظت پر قربان ہو چکے ہیں۔ کاش الفاظ ان بیسزوں کی خصلت بدل سکتے جنہیں انسانوں کے خون کی پیاس رو سیکھنے میں لے آئی ہے۔ اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا کہ اس وطن سے نکل جائیں جس کی خاک میں ہمارے اسلاف کی ہڈیاں دفن ہیں۔ یہاں اب انسانوں کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے۔ نہ معلوم اب رو سیکھنے کی کتنی بیستوں میں ایری بستی کی داستان دہرائی جائے گی۔ اگر صرف ایری ذات کے لیے خطرہ ہوتا تو میں یہاں سے ہجرت کرنا گوارا کرتا لیکن میرے سامنے پورے قبیلے کا مسئلہ ہے۔ میرے سامنے ان میں بچوں اور بیوہ ماؤں اور بہنوں کا مسئلہ ہے۔ جن کے باپ اور شوہر جنگ میں شہید ہو چکے ہیں انہیں اس ملک میں سرھپانے کے لیے کسی جگہ پناہ کی ضرورت ہے۔ میرے بزرگ بھائی معظ علی خاں کو اصرار ہے کہ ہم ان کے ساتھ میسور چلے جائیں لیکن جو کچھ میسور کے متعلق میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا قلعہ ہے جہاں بہترین ہارپون کی ضرورت ہے، حیدر علی کے متعلق میں نے سنا ہے کہ وہ ایک فیاض حکمران ہے لیکن انگریزوں اور مرہٹوں کے خلاف اس کے جنگ کے نتائج کے متعلق کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ ان بے سہارا عورتوں اور بچوں کے لیے میسور ایک اور رو سیکھنے بن جائے۔ بھائی معظ علی مجھ سے ناراض ہوں گے لیکن سردست میرا یہی فیصلہ ہے کہ ہم میسور کی بجائے حیدرآباد جائیں اور وہاں کسی ایسی جگہ آباد ہونے کے امکانات کا جائزہ لیں جہاں ہمیں قابل کاشت زمین مل سکتی ہو۔ قبیلے کے بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ہم یہاں سے دہلی، لاہور یا پٹنہ و رکازخ کریں۔ شمال کی طرف کہیں دوڑ نکل جانا ہمارے لیے یقیناً بہتر ہوگا لیکن کاش مجھے اس بات کا اطمینان ہوتا کہ وہاں کسی علاقے کی حکومت اتنے لوگوں کو سہارا دینے کے لیے تیار ہوگی۔ ایری اپنی

اور بوڑھے جنگل سے باہر نکل کر ان کی راہ دکھ رہے تھے۔ بلقیس نے اپنے شوہر کو دیکھا تو اس کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ تنہا شہباز خاں: "اباجان اباجان" کتا ہوا آگے بڑھا۔ اکبر خاں نے گھوڑے سے اتر کر اسے گلے سے لگا لیا۔ پھر اس نے بلقیس کے قریب جا کر سوال کیا: "تویر کہاں ہے؟"

بلقیس اس کے جواب میں ادھر ادھر دکھ رہی تھی کہ ایک فوجان لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا: "تویر میرے پاس ہے۔"

اکبر خاں نے شہباز کو نیچے اتار کر تویر کو اٹھا لیا۔ معظ علی اپنا گھوڑا ایک آدمی کے حوالے کرنے کے بعد آگے بڑھا اور اس نے اکبر خاں کے قریب آکر کہا: "اب سوچنے یا باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ ہمیں فوراً یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔ آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ ان کا کیا ارادہ ہے؟"

اکبر خاں نے کہا: "میرا خیال تھا کہ ہمارے پیدل آنے والے ساتھی بھی یہاں پہنچ جائیں تو سب کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا جائے۔"

معظ علی نے کہا: "تویر بہتر ہوگا کہ ہم جنگل میں ان کا انتظار کریں۔"

"بہت اچھا! اکبر خاں یہ کہہ کر قبیلے کے لوگوں سے مخاطب ہوا: "آپ سب جنگل میں اسی جگہ واپس پہنچ جائیں۔ ہمارے باقی آدمی پیدل آ رہے ہیں اور وہ ابھی پہنچ جائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد قبیلے کے لوگ جنگل میں بیٹھے اکبر خاں کی تقریر سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے:

"بھائیو اور بہنو! میں اب تمہیں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ اس وقت ہم کتنی بڑی تباہی کا سامنا کر رہے ہیں۔ میرا دل پور کٹھہ کی جنگ میں ہماری قوم کا بہترین خون پرچکا ہے۔ ہماری تواریں ٹوٹ چکی ہیں اور اب ہمارے پاس آنسوؤں کا

متعلق فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے جو لوگ میرے بھائی اکبر خاں کا ساتھ دینا چاہیں ہم انہیں نہیں روکیں گے اور مجھے امید ہے کہ اکبر خاں کے طرفدار بھی ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

یہ بحث ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی۔ بالآخر معظم علی اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے کہا۔ "بھائی! میں آپ کو میسرانے کی دعوت دے چکا ہوں لیکن اکبر خاں کے لیے میرا مشورہ قابل قبول نہیں۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ وقت ضائع نہ کریں اور جلد جلد کسی نتیجے پر پہنچ جائیں۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب بحث کو طول دینے سے کوئی فائدہ نہیں جو لوگ شمال کی طرف جانا چاہتے ہیں، میں انہیں روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں ان کے لیے دعا کروں گا کہ خدا ان کا حامی و ناصر ہو لیکن میری پہلی ذمہ داری ان بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی پرورش ہے جو اب بے سہارا ہو چکے ہیں اور مجھے یہ اعتماد ہے کہ میں ان کے لیے حیدرآباد پہنچ کر بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ اگر وہاں کے حالات طبعاً بخیر نہ ہوتے تو میری دوسری منزل میسر ہوگی۔ بہر حال اگر مجھے معلوم ہو کہ میرے وہ بھائی جو دوسری طرف جانا چاہتے ہیں کوئی تسلی بخش جائے پناہ تلاش کر چکے ہیں تو ہم بھی شاید کسی دن وہاں پہنچ جائیں۔ متور خاں! تم تیاری کرو اب باتوں کے لیے وقت نہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم یہیں سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں۔"

تھوڑی دیر بعد متور خاں اور اکبر خاں کی قیادت میں دو قافلے مختلف سمتوں کو روانہ ہو رہے تھے۔ ایک کا رخ شمال مغرب کی طرف تھا اور دوسرے کی منزل مقصود حیدرآباد تھی۔ اکبر خاں کے ساتھ بارہ سوا فرادے تھے، جن میں سے نصف سے زیادہ لاوارث بچے اور بیوہ عورتیں تھیں۔ بلقیس اپنی بچی تنویر کو گود میں لیے ایک گھوڑے پر سوار تھی اور شہباز

راستے سردست یہی ہے کہ ہم حیدرآباد جائیں۔ تاہم میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مستحق طور پر کوئی فیصلہ کیا جائے۔"

معظم علی پریشانی اور اضطراب کی حالت میں اکبر خاں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب وہ تقریر کر کے بیٹھ گیا تو معظم علی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب بیٹھے ہوتے دہنی زبان میں کہا۔ "اکبر خاں میرا خیال تھا کہ آپ میسر جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟"

اکبر خاں نے جواب دیا۔ "میں اس موضوع پر آپ کے ساتھ طعندگی میں بات کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میں آپ کی ناراضگی دور کر سکوں گا۔"

دوسری لہیتوں کے چھوٹے چھوٹے سردار اور قبیلے کے عمر رسیدہ لوگ انتہائی بخندگی کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ بعض لوگ اکبر خاں کا ساتھ دینے پر آمادہ تھے۔ لیکن بعض انتہائی شدید مدد کے ساتھ شمال کی طرف ہجرت کرنے کی حمایت کر رہے تھے۔ اکبر خاں کا ایک خالہ زاد بھائی متور خاں جو قبیلے میں اکبر خاں کے بعد سب سے زیادہ بلند و بالا کا مالک تھا، یہ کہہ رہا تھا کہ اس ملک کی کسی ریاست میں ہمارے لیے عزت اور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ میرا یہی مشورہ ہے کہ ہم ملک کے پار کوئی جائے پناہ تلاش کریں۔ یہ ناہل، بد طبیعت اور سفاک حکمران اس ملک کے لیے ایک لعنت ہیں اور میرے نزدیک ادودہ، حیدرآباد اور میسر میں کوئی فرق نہیں۔ اگر ہمارے مقدر میں صرف ذلت اور رسوائی ہے تو ہم یہیں رہ کر ادودہ کی غلامی کیوں نہ قبول کر لیں۔ آپ یہ کہیں گے کہ یہاں آزادی سے محروم ہونے کے بعد ہماری بھلا کو بھی خطرہ ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کسی اور حکمران کی غلامی ہماری بھلا کے لیے خطرناک نہ ہوگی؟"

قبیلے کے ایک اور بااثر آدمی نے اٹھ کر کہا۔ "بھائیو! میری بھی یہی رائے ہے کہ ہم شمال کا رخ کریں لیکن موجودہ حالات میں آپ میں سے ہر شخص اپنے مستقبل کے

آپ یہ کہتے ہیں کہ مسور کا حکمران حیدرآباد کے حکمران کی نسبت کہیں زیادہ بیلائے فر، دور اندیش اور بہادر ہے اور اس کے سامنے ایسے مقاصد ہیں جن کے لیے توڑا اٹھانا ایک ننگ ہے لیکن بھائی جان اگر آپ خفا نہ ہوں تو میں یہ کہوں گا کہ اب میں کسی حکمران کو بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا اب انسانیت سے میرا اعتماد اٹھ چکا ہے۔ حکمرانوں کی عاقبت اندیشی، نیکی اور شرافت میرے لیے ایک سراب ہے اور مجھ میں اس سراب کے پیچھے دوڑنے کی ہمت نہیں رہی۔ آپ بنگال کی آزادی کے محافظ بن کر میدان میں نکلے تھے لیکن آپ کو کیا حاصل ہوا؟ اور جب میں پانی پیت کے میدان میں لڑ رہا تھا تو میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اس جنگ کے بعد روسیہ سپاہیوں کو ادھ، دلی اور حیدرآباد کے امراء اپنا من خیال کریں گے لیکن ہماری قربانیوں کا جو صلہ ہمیں فواید دہا دہ نے دیا ہے وہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ ہمان کے دشمنوں کو کوسوں دور رکھنے کے لیے گئے تھے لیکن انھوں نے کوسوں دور بیٹھ کر ہماری تباہی و بربادی کا تماشا دیکھا ہے۔ میں ان لوگوں کے لیے ایثار و خلوص کے ہر جذبہ سے محروم ہو چکا ہوں جن کی بے حسی کے باعث ہماری بستیوں راکھ کے ڈھیر بن گئی ہیں۔

آپ میرے محن ہیں۔ آپ نے میری مدد کی ہے اور آپ کے لیے میں اپنے جسم کی بوٹیاں بچانے کے لیے تیار ہوں لیکن آج سے میں یہ عہد کر چکا ہوں کہ میری تلوار کسی حکمران کے لیے نہیں اٹھی گی۔ میں ایک کسان ہوں گا۔ میں ایک چرواہا بنوں گا میری زندگی کا اب پہلا دور آخری مقصد ان بے بس لوگوں کی حفاظت اور پرورش ہے۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ حیدر علی نہ صرف مسور بلکہ ادھ اور حیدرآباد کے مسلمانوں کی آزادی اور بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں لیکن یہی وجہ ہے جو میں مسور جانے سے ڈرتا ہوں۔ میں اور میرے قبیلے کے جانناؤں نے بھی ان لوگوں کی بقا اور آزادی کے لیے جنگ لڑی تھی لیکن ہماری بے لوث قربانیاں ان دونوں کی خصلت نہیں بدل سکیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ یہ احسان فراموشی تو ہمیں ہماری طرح حیدر علی کو بھی اپنا دشمن نہ سمجھے۔

دوسرے گھوڑے پر اکبر خاں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ معظم علی اور اس کے ساتھ قابضی کے آگے بیچھے اور دائیں بائیں مسلح آدمیوں کو ہدایات دے رہے تھے۔ کوئی دو کوس چلنے کے بعد اکبر خاں نے اپنا گھوڑا معظم علی کے قریب لے جا کر کہا۔ بھائی جان آپ مجھ سے خفا ہیں؟ اگر آپ کا حکم ہے تو میں حیدرآباد کی بجائے مسور جانے کو تیار ہوں۔

”نہیں! معظم علی نے جواب دیا۔ میں اب تمہیں مسور جانے کے سعلق نہیں کوں گا۔“

اکبر خاں نے کہا۔ ”حیدرآباد جانے کے متعلق میرا فیصلہ بلاوجہ نہیں۔ شیخ فرالدین اور مرزا طاہر بیگ کو ایک مدت سے یہ اصرار تھا کہ میں اپنے خاندان سمیت رد سبکھنڈ چھوڑ کر حیدرآباد میں آباد ہو جاؤں۔ جن دنوں مرہٹوں نے ہمارے ساتھ چھوڑ چھوڑ شروع کی تھی حیدرآباد سے شیخ فرالدین اور ادھوئی سے طاہر بیگ کے ایلچی میرے پاس آئے تھے۔ انھوں نے یہ پیغام بھیجے تھے کہ اب رد سبکھنڈ کی بجائے نظام کی سلطنت بہت زیادہ محفوظ ہے۔ اس لیے جب تک ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہوتے تم یہاں آ جاؤ۔ میں نے انھیں یہ جواب دیا تھا کہ میں اپنے قبیلے کا سردار ہوں اور میرا مرنا اور جینا ان کے ساتھ ہے۔“

اس کے بعد مجھے شیخ فرالدین کا ایک اور خط ملا۔ انھوں نے یہ لکھا تھا کہ اگر ہم چاہو تو حیدرآباد یا ادھوئی میں تمہارے تمام قبیلے کو آباد کرنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے اور میں نے اسے ایک مذاق سمجھا تھا۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے حیدرآباد یا ادھوئی کے آس پاس اتنی زمین مل جائے جس میں یہ لیے سہارا لوگ امن و چین کے دن گزار سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی بردت مجھے ایسی جگہ مسور میں بھی مل سکتی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مسور کا مستقبل حیدرآباد کی نسبت کہیں زیادہ خردمند ہے۔

بھائی جان! میری پونجی میرے بٹے ہوئے گھر کی راکھ اور ان بے سہارا لوگوں کے آنسو ہیں۔ میں نظام کے پاس جا کر یہ کہوں گا کہ اگر تمہیں اچھے کسانوں اور اچھے چرواہوں کی ضرورت ہے تو ہمیں اپنی مملکت میں آباد کر لو لیکن اگر یہاں صرف تمہارے اقتدار کے پرچم اٹھانے والے سپاہیوں کی ضرورت ہے تو ہم واپس جانے کے لیے تیار ہیں۔

مستظم علی نے کہا۔ میں تمہارے احساسات سے غافل نہیں۔ تم نے ایک بھی ایک ترین انقلاب دیکھا ہے لیکن یقین کرو جب میں نے بنگال سے ہجرت کی تھی اس وقت میرے دل میں بھی اسی طرح کے خیالات تھے۔ میں بھی یہ سوچا کرتا تھا کہ میں اب کسی حکمران کے ساتھ سروکار نہیں رکھوں گا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے تجارت شروع کر دی تھی لیکن دلنے کا کوئی انقلاب سلگتی ہوئی آگ سے دھواں اور دیکھتے ہوئے انگاروں سے حرارت جدا نہیں کر سکتا۔ میں دعا کروں گا کہ حیدرآباد میں تم امن اور سکون کی زندگی گزار سکو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم کسی دن میسور ضرور آؤ گے۔ دن کا سب سے بڑا زمیندار بن جانے کے باوجود تم کسی دن یہ محسوس کرو گے کہ تمہاری آخری منزل سرنگاپم ہے۔

میرا پور کٹڑہ کی شکست کے بعد روہیلوں کے سامنے موت یا ہجرت کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ ایٹھ اٹھیا کہنی اور اودھ کے سپاہی انہیں جنگی جانوروں کی طرح گھیر گھر کر قتل کر رہے تھے۔ ان کی بستیاں جلائی جا رہی تھیں۔ آگ اور خون کے اس طوفان سے بچ کر بھاگ نکلنے والے دروازوں علاقوں میں پناہ لے رہے تھے۔

یہ جنگ کسی حکومت یا فوج کے خلاف نہ تھی بلکہ ان انسانوں کے خلاف تھی جن کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ کسی میر جعفر، کسی شجاع اللہ یا کسی نظام علی خاں۔ جیسے ملت فردس کے اطاعت گزار نہ تھے۔ وہ سیکھنڈ کی سرزمین اس شریعت، بہادر اور نئی قوم کے فرزندوں کے خون سے لالہ زار تھی اور وہ سیکھنڈ سے باہر اس قوم کی بے بسی کے

آنسو پونجی والا کوئی نہ تھا۔ مہاجرین کے قافلے اپنی جنم جہوم چھوڑ کر پہاڑوں، جنگلوں اور بیابانوں میں پناہ لے رہے تھے۔ ان کا مہنی اجڑی ہوئی بستیوں، بے گوردکن لاشوں اور لٹی ہوئی عصمتوں کی داستانوں سے بے خبر نہ تھا۔ چند دنوں کے اندر اندر ایک لاکھ انسان جلا وطنی کی حالت میں ہزرت، افلاس، قحط اور طرح طرح کی وباؤں کا سامنا کر رہے تھے۔ نواب وزیر اودھ اس بات پر خوش تھا کہ اس کی سلطنت میں ایک سرسبز و شاداب خطہ زمین کا اسٹاز ہو گیا ہے۔ مگر یہ خوش تھے کہ ہندوستان کا ایک بازو سے شمشیر زن کٹ چکا ہے اور ہٹے خوش تھے کہ وہ لوگ جو کسی وقت دلی میں ان کے بدمقابل بن سکتے تھے۔ پوری طرح مغلوب ہو چکے ہیں۔

جو قافلہ معظم علی اور اکبر خاں کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ ان گنت مصائب کا سامنا کرنے کے بعد ایک دن حیدرآباد کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ راستے میں دو مقامات پر ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا لیکن قافلے کے محافظوں کے ساتھ معمولی جھڑپوں کے بعد وہ بھاگ گئے۔ معظم علی کو اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ اودھ کی فوج ان کا تعاقب کرے گی لیکن اودھ کی فوج کا سپر سالار فوج کے جشن میں حصہ لینے کے لیے کھنڈر پہنچ چکا تھا اور اس کے سپاہی اکبر خاں کی ہستی پر حملہ کرنے والے ساتھیوں کے انجام سے بے خبر وہ بیکھنڈ کے طول عرض میں قتل و غارت اور لوٹ مار میں مصروف تھے۔

چار دن بعد جب انگریزی فوج کے افسروں کو اپنے ساتھیوں کے انجام کا پتہ چلا تو یہ قافلہ کوئی منزلیں دود چکا تھا۔

حیدرآباد کے دارالحکومت سے تین منزل کے فاصلے پر معظم علی نے اکبر خاں سے کہا۔ میرے دوست اب تمہاری منزل قریب آگئی ہے۔ مجھے بہت جلد سرنگاپم واپس پہنچنا چاہیے تھا۔ اب مجھے اجازت دو اور یہ وعدہ کرو کہ اگر حیدرآباد کے حالات تمہاری توقع کے مطابق نہ ہوتے تو تم میرے پاس آ جاؤ گے۔

ظاہر بیگ کے اثر و سوخ کے باعث دریائے کرشنا اور تنگ بھدرہ کے درمیان آباد ہونے کے لیے زمین کا ایک وسیع قطعہ نہایت سستے داموں میں مل گیا ہے۔ میرے قبیلے کے لوگ اپنے گھر چھوڑتے وقت جو نقدی اپنے ساتھ لائے تھے، وہ ہمارے کام آئی۔ یہ علاقہ مرہٹوں کی مملکت کی سرحد سے صرف چند میل دور ہے۔ ہم نے کچھ زمین ان زمینداروں سے خرید لی ہے جو مرہٹوں کی چھڑ چھاڑ کے خوف سے ادھونی کے آس پاس آباد ہونا چاہتے تھے۔ باقی زمین سرکاری ہے اور ہمیں اس کے لیے ادھونی کی حکومت کو کوئی معاوضہ نہیں دینا پڑا۔ صرف یہ شرط رکھی گئی ہے کہ اگر مرہٹوں کی طرف سے کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم اپنی حفاظت کے ذمہ دار خود ہوں گے۔ یہ زمین بہت اچھی ہے لیکن جنگل صاف کر کے اسے قابل کاشت بنانے میں ہمیں کچھ عرصہ سخت محنت کرنی پڑے گی۔

شیخ فخر الدین کی کوشش تھی کہ مجھے حیدرآباد کے گرد و نواح میں کوئی جاگیر مل جائے اور وہ اپنی کوشش میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے لیکن مجھے ایک جاگیر دار کی حیثیت سے نظام کی فوج کے لیے کرانے کے سپاہی مہیا کرنا منظور نہ تھا۔ ادھونی کی حکومت کے ساتھ میرا یہ معاہدہ ہوا ہے کہ جتنی زمین آباد ہوتی جائے گی ہم اس کا لگان ادا کرتے جائیں گے اور ہم سے کسی وقت سپاہی مہیا کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

رد سیکھنڈ کے کئی اور قبیلے ابھی تک اس ملک میں سرگرداں پھر رہے ہیں کوئی پانچ سو آدمی مجھ سے دو ماہ بعد حیدرآباد پہنچے تھے اور میں انہیں یہاں لے آیا ہوں۔ اگر حالات نے اجازت دی تو ہم دین سال کے اندر اندر اس غیر آباد جنگل کو بہلتے کھیل میں تبدیل کر دیں گے۔ بھیلوں کے چند قبیلے اس جنگل میں صرف شکار پر گزارہ کرتے تھے لیکن اب ہماری دہرے وہ بھی کھیتی باڑی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

"میں وعدہ کرتا ہوں، اکبر خاں نے جواب دیا۔  
معظم علی نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے خط کا انتظار کروں گا۔"  
جب وہ گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا تو بلقیس نے آنکھوں میں آنسو بہتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! بھائی جان کو میرا سلام کہیں۔ میں انہیں دیکھنے کے لیے کسی دن سرنگا پٹم ضرور آؤں گی۔"  
معظم علی نے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا تم ضرور آنا۔ مجھے ڈر ہے کہ حیدرآباد پہنچ کر تم ہمیں بھول جاؤ گے۔"  
معظم علی اور اس کے پانچ ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک طرف نکل گئے اور اکبر خاں نے قافلے کو کوچ کا حکم دیا۔

سرنگا پٹم پہنچ کر معظم علی نے دوبارہ فوجی تربیت گاہ کا انتظام سنبھال لیا۔ مرہٹوں کے ساتھ حیدر علی کی جنگ ابھی تک جاری تھی اور آٹے دن میسور کی سلطنت میں نئے نئے مفتوحہ علاقوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک سال تک معظم علی کو اکبر خاں کی طرف سے کوئی پیغام نہ ملا۔ ایک دن اس نے شیخ فخر الدین کی معرفت اسے خط لکھا۔ قریباً ایک ماہ بعد اکبر خاں کی طرف سے یہ جواب ملا:

"بھائی جان! آپ نے بلقیس کے ماموں جان کی معرفت جو خط لکھا تھا وہ میرے پاس دیر سے پہنچا۔ حیدرآباد پہنچنے کے بعد شیخ فخر الدین کی یہ کوشش تھی کہ میں ان کے ساتھ تجارت میں شریک ہو جاؤں مگر میرے سامنے اپنے قبیلے کے لوگوں کو بسانے کا مسئلہ تھا۔ عطیہ کا خاندان ظاہر بیگ میرے لیے ادھونی کی فوج میں ایک عہدے کی پیشکش لے کر آیا تھا لیکن میں اس پر بھی آمادہ نہ ہوا۔ اس کے بعد میں شیخ فخر الدین کی کوشش اور

## اٹھارواں باب

چھ سال اور گزر گئے۔ اس عرصہ میں مسیور کے سیکرٹوں نوجوان سرنگاپٹم کے فوجی مدرسہ سے قربیت حاصل کر کے خیردہلی کی فوج میں شامل ہو چکے تھے۔ معظم علی کے بیٹوں نے تلواریں کی جھنکار میں آنکھ کھولی تھی اور انھوں نے اس ماں کا دودھ پیا تھا جسے اپنے اور اپنے شوہر کے خاندان کی غیرت و شجاعت پر ناز تھا۔ یہ بچے ہوش سنبھالتے ہی جوں ، بھوتوں اور سانپوں کی کہانیاں سننے کی بجائے جنگوں کے واقعات سنا کر لے تھے اور بڑے ہو کر وہ اپنے باپ کی مجلس میں خیردہلی کی فوج کے نامور سپاہیوں اور بڑے بڑے افراد کو دیکھا کرتے تھے۔ صدیق علی سترہ سال کی عمر میں سرنگاپٹم کے فوجی مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر جہاز رانی کا تجربہ حاصل کرنے کے لیے اپنے فرانسیسی اتالیق کے ساتھ منگور جا چکا تھا۔ مسعود علی، ابوعلی اور مراد علی فوجی درسگاہ میں تعلیم پا رہے تھے۔ معظم علی اپنے تمام بچوں کو بہترین سپاہی اور بہترین عالم دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے گھر پر عربی اور فارسی کے علوم کی تعلیم دینے کی خدمت ایک ایرانی عالم کے سپرد کر رکھی تھی اور وہ خود بھی فرصت کے اوقات ان کی تعلیم و تربیت پر مصروف کیا کرتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مشرقی علاقوں میں انگریزوں کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک معمولی کلرک سے لے کر گورنر جنرل تک لوٹ مار میں مصروف تھے۔ بنگال کے شہروں کی تجارت تباہ ہو چکی تھی۔ خوشحال تاجروں

بھیل اپنے پاس ملازم رکھ لیے ہیں۔ اب یہ علاقہ ہماری چھوٹی سی دنیا ہے اور ہم اسے بیرونی طوفانوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ میرے دل میں اگر سرنگاپٹم آنے کا کوئی خیال تھا تو وہ اب جا چکا ہے۔ اب اگر میں کبھی آؤں گا تو صرف آپ کو دیکھنے کے لیے بلقیس آپ کو اور بھائی جان کو سلام کہتی ہے۔

آپ کا بھائی اکبر۔

اپنی نئی جلے پناہ سے یہ اکبر خاں کا پہلا اور آخری خط تھا۔ اس کے بعد یہ دوست اپنی اپنی دنیا کی تعمیر میں مصروف رہے اور کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ دوسرے کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔



کو کوڑی کوڑی کا محتاج بنا کر ترک وطن پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ یہ بعض کی ذلیل خدات کا اس کے پیمانگان کو یہ صلہ دیا گیا کہ وارن ہیسٹنگز نے ڈرا دھکا کر ان سے لاکھوں روپے وصول کیے۔ بنگال کے ایک عالی نسب اور جرات مند برہمن نے بنگال کے وارن ہیسٹنگز کی لوٹ مار کے خلاف آواز بلند کی اور وارن ہیسٹنگز نے اس کے بدلے نندکار کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ کھڑا کر کے اسے موت کی سزا دلا دی۔

بنگال کے امرا کو جی بھر کر لٹنے کے بعد وارن ہیسٹنگز نے بنارس کے راجہ چیت سنگھ کی طرف توجہ کی۔ راجہ چیت سنگھ نے اسے مطمئن کرنے کے لیے اپنے خزانے خالی کر دیئے لیکن اس کے پاس وارن ہیسٹنگز اور کمپنی کے دوسرے ملازمین کی بھوک کا کوئی علاج نہ تھا جوں جوں بنارس کے خزانے خالی ہوتے جا رہے تھے وارن ہیسٹنگز کے مطالبات بڑھتے جا رہے تھے بالآخر راجہ کے پاس کچھ نہ رہا تو ہیسٹنگز اس پر حکم عدولی کا الزام عائد کر کے خود بنارس پہنچا اور اس نے راجہ چیت سنگھ کی گرفتاری کا حکم دیا۔ انہیں راجہ نے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دینے کے لیے کسی مزاحمت کے بغیر اپنے آپ کو گرفتاری کیلئے پیش کر دیا لیکن بنارس کی فوج اور عوام اپنے راجہ کی یہ توہین برداشت نہ کر سکے انھوں نے انگریزوں کو سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور راجہ کو ان کی قید سے چھڑا لیا۔ ہیسٹنگز بنارس سے بھاگا اور اس نے ایک بڑی فوج جمع کر کے دوبارہ چڑھائی کی۔ راجہ چیت سنگھ اپنی جان اور عزت کے خوف سے گھمبیر کی طرف بھاگ گیا۔ وارن ہیسٹنگز نے چیت سنگھ کی جگہ اس کے بیٹے کو گدڑی پر بٹھا دیا اور اپنا خراج سوا دو لاکھ سے بڑھا کر چار لاکھ پاؤنڈ کر دیا۔

نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد اودھ کی حکومت اس کے بیٹے آصف الدولہ کے ہاتھ آئی۔ روہیکھنڈ پر قبضہ کرنے کے لیے وارن ہیسٹنگز سے مدد لینے کے باعث شجاع الدولہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقروض ہو چکا تھا۔ آصف الدولہ کے گدڑی پر بیٹھے ہی وارن ہیسٹنگز نے اس سے پندرہ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ آصف الدولہ

کے پاس روپیہ نہ تھا لیکن اس نے برٹش ریڈینٹ کی مدد سے اپنی بیوہ ماں اور دادی سے ساڑھے پانچ لاکھ پاؤنڈ کی رقم اس شرط پر حاصل کی کہ اس کے بعد وہ یا انگریز ان سے کوئی اور مطالبہ نہیں کریں گے لیکن وارن ہیسٹنگز کے کانوں تک بیگمات اودھ کی دولت کے قہقہے پہنچ چکے تھے اور وہ روپیہ حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ جائز سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے آصف الدولہ اور کھنوں کے انگریز ریڈینٹ کو بیگمات اودھ سے مزید روپیہ حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ جب آصف الدولہ ایک حد سے آگے جانے کے لیے تیار نہ ہوا تو ہیسٹنگز نے انگریز ریڈینٹ کو یہ حکم دیا کہ وہ انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ فیض آباد بھیج کر بیگمات کے معاملات کا محاصرہ کر لے اور انھیں ہر ممکن اذیت پہنچا کر روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ انگریز ریڈینٹ ڈلٹن نے جب بیگمات سے مزید روپیہ حاصل کرنے میں اپنی ناکامی کا اعتراف کیا تو وارن ہیسٹنگز نے اس مقصد کے لیے اس کی جگہ برسٹون نامی ایک نیا ریڈینٹ بھیج دیا۔ نئے ریڈینٹ نے بیگمات کے محل کا محاصرہ کرنے کے بعد ان کے نوکروں کو فراست میں لے لیا اور خفیہ خزانے کا پتہ معلوم کرنے کے لیے چند ماہ تک ان پر بے پناہ مظالم توڑتا رہا۔ چند سال قبل شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے روہیکھنڈ کی غیرت جوڑت اور آزادی پر حملہ کیا تھا اور اب یہی انگریز اس کے اپنے حرم تک پہنچ چکے تھے۔ اس کی بوڑھی ماں اور اودھ کی شہزادیاں تیلوں کی سی حالت میں اپنے ان نوکرؤں اور خادموں کی جنھیں سنا کرتی تھیں جنھیں انگریز سپاہی خفیہ خزانے کا راز معلوم کرنے کے لیے صبح و شام زور بوب کیا کرتے تھے۔ بالآخر جب قریباً ایک سال پترین اذیتیں برداشت کرنے کے بعد بیگمات نے سب کچھ انگریزوں کے حوالے کر دیا تو ان کی خلائی ہوئی۔

شاہ عالم ثانی جو چند سال قبل انگریزوں کی سرپرستی سے نکل کر مرہٹوں کی سرپرستی میں دلی کے تخت پر رونق افروز ہوا تھا اور جسے شاید یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی سلطنت

سیاست دان جنھوں نے چند سال قبل صرف اس امید پر معاہدہ مدراس کی شرائط کی خلاف ورزی کر کے حیدر علی کو مرہٹوں کے خلاف تنہا چھوڑ دیا تھا کہ مرہٹے اپنی بے پناہ قوت کے بل بوتے پر میسور کو فتح کریں گے اور وہ ان سے اپنا حصہ وصول کر سکیں گے، اپنے سامنے ان تو سے ہزار سواروں کی فوج دیکھ رہے تھے جو انھیں سمندر کی طرف دھکیلنے کے ارادے سے میدان میں آچکی تھی۔ مدراس کے گورنر نے اس صورتِ حالات کا سامنا کرنے کے لیے کپتانی کے لشکر کی قیادت کبکس کے فاتح سرسہیکر منرو کو سونپی اور کرنل ہیلی کو حکم بھیجا کہ وہ گنڈیور سے اپنی فوج کے ساتھ پیش قدمی کر کے سرسہیکر منرو کے ساتھ آئے۔

جنرل منرو مدراس سے روانہ ہوا اور کبھی درم پہنچ کر کرنل ہیلی کا انتظار کرنے لگا۔ حیدر علی نے شہزادہ ٹیپو کو کرنل ہیلی کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کیا اور خود اراکات کا محاصرہ چھوڑ کر کبھی درم کی طرف بڑھا۔ ٹیپو نے کرنل ہیلی کے لشکر کو کبھی درم سے پندرہ میل لے کے فاصلے پر جالیا اور پہلی جھڑپ میں اس کے دوسو سپاہی ہلاک کر دیئے۔ اس عرصہ میں ٹیپو کی مدد کے لیے سپاہیوں کے چند دستے پہنچ گئے اور کرنل ہیلی نے سرسہیکر منرو کو پیغام بھیجا کہ وہ فوری مدد کے بغیر ٹیپو کا محاصرہ توڑ کر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ۹ ستمبر کو سرسہیکر منرو نے کرنل ہیلی کی مدد کے لیے ایک ہزار سپاہیوں کی کمک بھیجی اور اسی رات نے اس نے کبھی درم کی طرف کوچ کر دیا لیکن ٹیپو کی فوج نے اس کا پھیلنا چھوڑا۔ کبھی درم سے نو میل کے فاصلے پر کرنل ہیلی نے اپنی فوج کو پٹاڑ ڈالنے کا حکم دیا۔ اسے یہ امید تھی کہ صبح تک منرو بذاتِ خود اس کی مدد کے لیے پہنچ جائے گا لیکن صبح ہوتے ہی ٹیپو کی فوج نے عقب سے اس پر گولہ باری شروع کر دی اس کے ساتھ ہی حیدر علی کبھی درم کا رخ کرنے کی بجائے ٹیپو کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ کرنل ہیلی نے مایوسی کی حالت میں پیش قدمی شروع کی لیکن وہ عقب سے توپوں کی گولہ باری اور بازوؤں سے میسور کے سواروں کے حملوں کے باعث سبقت پر سخت تباہی کا سامنا کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے

کاٹیا حدود اور بے کمال سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے، ایک خاموش بے بس تماشائی کی حیثیت میں یہ تمام واقعات دیکھ رہا تھا۔

جنوبی ہندوستان میں کرناٹک کے حالات بنگال، اودھ اور بنارس سے بھی بدتر تھے۔ محمد علی والا جاہ نظام کرناٹک کا حکمران تھا لیکن درحقیقت وہ ایک ایسا کولھو تھا جس سے انگریز اہل کرناٹک کا خون پھوڑنے کا کام لے رہے تھے۔ والا جاہ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ انگریز میسور فتح کریں اور پھر اس کے بعض حصے انکاٹ کی سلطنت میں شامل کر دیئے جائیں تاکہ انگریزوں کے دسترخوان کے نیچے ٹھٹوں سے اس بیگمات اور شہزادوں کی پرورش کا بہتر انتظام ہو سکے جن کی تعداد اب دہشتہ تک پہنچ چکی تھی۔

تیسری اور شرفت کا منہ نوچا جا رہا تھا۔ انسانوں کی تقدیر درندوں کے ہاتھ میں تھی۔ کرناٹک کے تباہ حال لوگ کسی نجات دہندہ کی تلاش میں تھے۔ قدرت کی انتظامی قوتیں حرکت میں آئیں۔ ایک آتش فشاں پہاڑ پھٹا اور کرناٹک میں انادلاغیری کا لغزہ لگانے والے انگریز اس کے دلہنے پر کھڑے تھے۔ یہ حیدر علی تھا جو ایک آتشیں سیلاب کے ساتھ میسور سے نکلا اور کرناٹک پر چھا گیا۔ سات سمندر پار سے آنے والے وہ تاجر چوہانی عیاری اور مکاری کی بدولت ہندوستان پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اس سیلاب کے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔ وہ چوہانی توپوں کی دھندا دھن کے جواب میں بے بس انسانوں کی چینیں سننے کے عادی تھے اب ایک ایسی قوم کے جوانوں کی غیرت کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے جو ان کے انلازوں کے مطابق مفلوج ہو چکی تھی اور وہ جو اس ملک کے نابل امرار کی ملت فردشی اور ابن الوقتی کو اپنی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت خیال کرتے تھے، حیدر علی کے دائیں بائیں وقت کے بہترین جرینل دیکھ رہے تھے وہ انگریز

انتہائی عجوبی کی حالت میں کئی درم سے چھ میل کے فاصلے پر جم کر لڑنے کا فیصلہ لیا، لیکن اتنی دیر میں ٹیپو کی مدد کے لیے حیدر علی کا توپ خانہ بھی پہنچ چکا تھا۔ توپوں کی دوڑ گولہ باری کے باعث انگریزوں کی فوج میں افزائری پڑ گئی۔ ان کی فوج کے دیسی سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور یورپین سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سر سیکر منرو کرن ہیلی کی شکست سے اس قدر بدحواس ہوا کہ وہ اپنی بھاری توپیں ایک تالاب میں پھینک کر مداس کی طرف بھاگ نکلا۔ ٹیپو کے طرفانی دستے اس کے پیچھے تھے۔ منرو قدم قدم پر لاشیں چھوڑتا ہوا انتہائی بے سرو سامانی اور بیچارگی کی حالت میں مداس پہنچا۔ مداس کے باشندے کبکسر کے فاتح کو اس حالت میں دیکھ کر تعجبے لگا لگا رہے تھے۔

شہزادہ ٹیپو، ہمز دی فوج کا جنم سامان اور رسد کے ذخیرے چھیننے کے بعد دوبارہ اپنے باپ سے جا ملا۔ میسور کا لشکر کرناٹک کے دارالحکومت ارکاٹ کی طرف بٹھا اور عمعلی والا جاہ اپنے انگریز سرپرستوں سمیت وہاں سے بھاگ نکلا اور ماہ اکتوبر ۱۷۸۰ء میں ارکاٹ پر حیدر علی کی فوج کا پرچم لہرا رہا تھا۔

حیدر علی ارکاٹ کو اپنا مستقر بنا کر مشنوجہ علاقوں کے انتظامات میں مصروف ہو گیا اور ٹیپو نے دس ہزار سواروں کے ساتھ پیشقدمی کر کے ست گڑھ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ بہت مضبوط تھا اور دو ہزار سپاہی، جن کے پاس کئی مہینوں کے لیے اسلحہ بارود اور رسد کے ذخیرے موجود تھے، اس کی حفاظت پر متعین تھے لیکن قلعے کے محافظ نے شہزادہ ٹیپو کے پلے در پلے حملوں سے بدحواس ہو کر ۱۳ جنوری ۱۷۸۱ء کو ہتھیار ڈال دیئے اس کے بعد ٹیپو نے انور کے قلعے پر حملہ کیا۔ اس قلعے کا محافظ ایک انگریز کپٹن کیٹن تھا۔ وہ قریباً پندرہ دن تک حملہ آور فوج کا مقابلہ کرتا رہا لیکن جب بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ہتھیار ڈال دیئے۔

کرناٹک کے ان دو اہم قلعوں پر قبضہ کرنے کے بعد شہزادہ ٹیپو نے تیار گڑھ کی طرف پیش قدمی کی۔ چار ہفتوں کے محاصرہ کے بعد جب اس کی فوج تیار گڑھ کے قلعے پر فیصلہ کن حملہ کر چکی تھی انگریز کمانڈر نے فوج پر صلح کے جھنڈے بلند کر دیئے۔ ٹیپو نے فوج کی گولہ باری بند کر دینے کا حکم دیا لیکن اگلے دن جب انگریز کمانڈر نے قلعہ خالی کرنے والا تھا اسے یہ اطلاع ملی کہ سر آرکوٹ ایک لگ کے ساتھ پہنچنے والا ہے اور اس نے قلعہ خالی کرنے کی بجائے میسور کی فوج پر گولہ باری شروع کر دی۔ جنگ دوبارہ شروع ہو گئی لیکن چند دن بعد قلعے کے محافظوں کو معلوم ہوا کہ سر آرکوٹ چند منازل دور پڑاؤ ڈالے رسد کا انتظام کر رہا ہے۔ انگریز کمانڈر نے دوبارہ قلعہ خالی کرنے کی پیشکش کی لیکن ٹیپو نے اسے کوئی رعایت دینے سے انکار کر دیا اور ایک شدید حملے کے بعد قلعہ فتح کر لیا۔

اب کرناٹک کے مضبوط ترین قلعے فتح ہو چکے تھے اور ٹیپو کی فوج کسی دقت کا سامنا کیے بغیر چھوٹے چھوٹے قلعوں اور چوکیوں سے دشمن کا صفایا کر رہی تھی۔ جون کے مہینے میں شہزادہ ٹیپو شاندار فتوحات کے بعد ارکاٹ پہنچا تو حیدر علی نے شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا اور صرف ایک حکمران کی طرف سے اپنے ولی عہد کا استقبال نہ تھا بلکہ ایک اولوالعزم سپہ سالار کی طرف سے اپنی فوج کے اس نوعمر جنرل کا خیر مقدم تھا جس کی قابلیت اور بہادری کی داستانیں سات سمندر پار تک پہنچ چکی تھیں۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں حیدر علی اس بوڑھے عقاب کی مانند تھا جو نشین سے اپنے نوعمر بچے کی پرواز دیکھ رہا ہو۔ اس نے اپنی تلوار کی نوک سے ہندوستان کے نقشے پر ایک عظیم سلطنت کی حدود کی لکیریں کھینچ دی تھیں اور اس کا ولی عہد اس سلطنت کے خاکے میں نئے نئے رنگ بھر رہا تھا۔ حیدر علی کے آزمودہ کار جنرل ہرمیدان میں ٹیپو کی قیادت کو فوج کی ضمانت سمجھتے تھے۔ کرناٹک کی جنگ کے دوسرے سال میسور کے اس اولوالعزم حکمران کے قریبی جواب دے چکے تھے۔ جس کی جوانی کے بیشتر ایام تلواروں

کی چھاؤں میں گزر سکتے تھے۔ اب اس کے لیے زندگی کی آخری خوشی یہ تھی کہ کسی حکمران کو ٹیپو سے بہتر جانشین نہیں مل سکتا۔

ٹیپو، کرنل سیلی اور جرنیل مزد کے بعد سرگز کوٹ اور اسٹورٹ جیسے جہاندرہ نپو سے اپنا لواٹنا چکا تھا۔ ارکاٹ میں انگریزوں کی قوت مدافعت کچلنے کے بعد وہ تنجور کی طرف بڑھا اور اس کے سامنے انگریزوں کی افواج بیٹھنے کی طرح بھاگ رہی تھیں۔ کرنل بریٹھ دیت جسے اپنی توپوں کے بل بوتے پر کئی ہفتے مقابلہ کرنے کی امید تھی، ۲۶ گھنٹوں کے بعد اپنی ٹوار پھینک چکا تھا۔

بریٹھ دیت کو شکست دینے کے بعد ٹیپو نے کسی وقت کا سامنا کیے بغیر تنجور کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ فروری ۱۷۸۲ء کے آخری دنوں میں حیدر علی کی ہدایت پر ٹیپو تنجور سے پہلے انونود کی طرف بڑھا۔ وہاں سے اس نے فرانسسیسی دستوں کو ساتھ لے کر پشیمدی کی اور کلاور پر قبضہ کر لیا۔ مئی کے مہینے ٹیپو کی فوج اور فرانسسیسی دستوں نے حیدر علی کے لشکر کے ساتھ شامل ہو کر پانڈی چری کے شمال مغرب میں پرمول کے پہلے قلعے پر حملہ کر دیا۔ جنرل آرنکوٹ نے قلعے کی محافظ فوج کو مدد دینے کے لیے پشیمدی کی لیکن وہ ابھی رنگلی پہنچا تھا کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ میسور کی فوج قلعے پر قبضہ کر چکی ہے۔ جنرل آرنکوٹ نے میسور کی افواج کے رسد اور بارود کے ذخائر پر قبضہ کرنے کی نیت سے ارنی کا رخ کیا لیکن حیدر علی نے انگریزوں کی پشیمدی کی اطلاع ملنے ہی ٹیپو کو ان کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کیا۔ دو دنوں کی صبح جنرل آرنکوٹ کی فوج ایک طرف ٹیپو کے لشکر اور فرانسسیسی دستوں کی گولہ باری کا سامنا کر رہی تھی۔ دوسری طرف حیدر علی یلغار کرتا ہوا ان کے عقب سے حملہ آور ہوا۔ جنرل آرنکوٹ کی فوج بھاری اسلحہ اور رسد کی گاڑیاں چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ سر آرنکوٹ جس تیز رفتاری سے میسور کے خلاف قوت آزمائی کے لیے آیا تھا اس سے کہیں زیادہ رفتار سے واپس سراس کا رخ کر رہا تھا:

جنگ کے زمانے میں معظم علی کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ فوجی تربیت گاہ کے نگران کی حیثیت میں سلطنتِ خداداد کی ایک اہم ضرورت پوری کر رہا ہے۔ فوجی تربیت گاہ کی بگڑانی کے علاوہ سرنگاپٹم کے قلعے کی توسیع اور نئے مورچوں کی تعمیر کا کام بھی اسے سونپا جا چکا تھا۔ اس کے پاس ان فوجیوں کے خطوط آتے جو فوجی مدرسے سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد میسور کی فوج میں شامل ہو کر دشمن کے خلاف مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے۔ تاہم وہ بڑی شدت سے یہ عرصہ گزر رہا تھا کہ وہ میدانِ جنگ سے دور ہے۔ اس کا بڑا بیٹا صدیق علی میسور کے ایک جنگی جہاز کا کپتان بن چکا تھا اور معظم علی کو اس کے متعلق نہایت مصلحت افزا خبریں مل رہی تھیں۔ اس سے چھوٹا مسعود علی فارغ التحصیل ہونے کے بعد بڑی فوج میں شامل ہو چکا تھا۔

جنگ کے دوسرے سال معظم علی فارغ التحصیل طلباء کے سامنے الوداعی تقریر کر رہا تھا جن میں اس کے تیسرے بیٹے انور علی کا نام سرفہرست تھا۔ اس نے کہا:

”میرے عزیزو! مجھے تمہاری خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ تم نے اس سرزمین میں جنم لیا ہے جہاں عزت کی زندگی اور عزت کی موت کے راستے کھلے ہیں تم اس حکمران کی فوج کے سپاہی بننے جا رہے ہو جس کی نگاہیں اپنے دست اور دشمن میں تیز کر سکتی ہیں۔ تم اس دور کے بہترین جرنیلوں کی رہنمائی میں جانفروئی کے جوہر دکھا سکو گے۔ میرے بل اب سفید ہو چکے ہیں لیکن ایک زمانہ تھا جب میری رگوں میں خون کی بجائے بھیلیاں دوڑتی تھیں۔ جوانی میں میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں کسی راجہ عظیم کی فتوحات میں حصہ دار بنوں لیکن میں نے ایسی سرزمین میں آنکھ کھولی تھی جہاں آزادی کے پرستاروں کے لیے تیرے نانون کی تاریک کوٹھڑیاں تھیں اور مہمانِ قوم وطن کے لیے پیمانے کے پھندے تھے جہاں قوم کے شہیدوں کی لاشوں کو پیروں تلے روندنا جاتا تھا اور ملتِ فردوس میں

کے لیے حکومت کی سندیں سجائی جاتی تھیں۔

لیکن تمہیں قدرت نے ان پر سالاروں کی قیادت میں لڑنے کا موقع دیا ہے جن کے گھوڑوں کی رکھوالی کرنا بھی میرے نزدیک ایک سعادت ہے۔ میں شہادہ فتح علی کی فتوحات کے متعلق سنتا ہوں تو میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کاش میں یہاں پیدا ہوتا۔ میرا بچپن میری جوانی اور میرا بڑھاپا ان کے ساتھ گزرتا۔ ایک قافلے کی اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا امیر اپنے راستے کے نشیب و فراز پر نگاہ رکھتا ہے اور ایک سپاہی کے لیے قدرت کا اس سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کا پر سالار کسی مقصد کے لیے قربانی دینا جانتا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ تمہاری جرات اور ہمت نواب حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو کے بلند عزائم کا ساتھ دے سکے اور میں اس بات پر فخر کروں کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

ایک ہفتہ بعد انور علی، حیدر علی کے نامور جرنیل غازی کی قیادت میں محاذ جنگ کو دروازہ پوکھا تھا اور اس کی کمان میں پچاس سو لاکھ تھے۔ اس کے بعد گھر میں معظم علی اور فرحت کی تمام دلچسپیاں نصفے مراد تک محدود ہو گئیں۔ مراد علی اپنے تمام بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین تھا۔ اس کی شوخیاں اور اس کی شرارتیں اس کے والدین، بھائیوں، نوکروں اور پڑوسیوں کی گفتگو کا موضوع بنی رہتی تھیں لیکن جب بیڑوں بھائی کے بعد دیگر سے گھر سے چلے گئے تو اسے اپنی مسکراہٹوں اور تقویوں کی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ بھائیوں کی موجودگی میں وہ مکتب سے فارغ ہونے کے بعد باقی سالاروں دن کھیں کوڑ میں گزارتا تھا لیکن وہ فرصت کے لمحات میں ہمیشہ ماں کے پاس رہنا پسند کرتا تھا۔ معظم علی کے بیٹے بڑی باقاعدگی کے ساتھ اسے خطوط بھیجا کرتے تھے۔ ان خطوط میں مراد علی کے متعلق اس قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔ "اس کی صحت کیسی ہے۔ اب بھی وہ اسی طرح شرارتیں کرتا ہے یا کچھ سنبیدہ ہو گیا ہے۔ محلے کے لڑکوں کے ساتھ

اس کی جنگیں ختم ہوئیں یا نہیں۔ صابر کے ساتھ اب بھی جھگڑا ہوا کرتا ہے یا نہیں۔ وہ بہت یاد آتا ہے۔" اور فرحت اپنے بیٹوں کو جواب میں لکھا کرتی تھی۔ مراد علی اب بہت بدل گیا ہے۔ اس کی شوخیاں تمہارے ساتھ رخصت ہو چکی ہیں۔ وہ میری تنہائی کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور مکتب سے فارغ ہو کر سیدھا گھر آ جاتا ہے۔ فوجی تربیت حاصل کرنے اور کتابیں پڑھنے کے علاوہ اس کی تمام دلچسپیاں جنگ کی خبریں سننے تک محدود ہو چکی ہیں۔



ایک دوپہر معظم علی، فرحت اور مراد مکان کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک مکان کے دروازے کی طرف گھوڑے کی ٹاپ سنا دی۔ تھوڑی دیر بعد صابر بھاگتا ہوا صحن میں داخل ہوا اور کمرے کے دروازے کے قریب بیچ کر بند آواز میں چلایا: "میں نے علی جان آگئے۔"

معظم علی اور فرحت کے چہرے سترت سے چمک اٹھے اور مراد علی بھائی جان، بھائی جان، کتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کے بعد معظم علی اور فرحت کمرے سے نکل کر باہر آئے۔ صدف علی مراد کو اپنے ساتھ چٹائے صحن میں داخل ہوا اور اس نے اپنے والدین کو سلام کیا، اس کے سر پر گولی کی بجائے سفید پٹی باندھی ہوئی تھی۔ فرحت منظر آ رہا اور جاسی کی حالت میں چند قدم آگے بڑھ کر بولی: "بیٹا کیا ہوا تم نے سر پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟"

امی جان میں زخمی ہو گیا تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔ زخم بہت معمولی تھا۔ گولی میری کھوپڑی کو چھوئی ہوئی نکل گئی تھی۔

مراد علی نے کہا: "امی جان! آپ نے غم نہیں کیا، بھائی جان نکلنا بھی رہے تھے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "مرا دم بہت شریر ہو۔ امی جان آپ پریشان نہ ہوں گھوٹے  
پر سفر کرتے کرتے میری ٹانگیں شل ہو گئی ہیں۔"  
منظ علی نے کہا۔ "بیٹا چلو اذر بیٹو! صابو غلام سے کہو ان کے لیے کھانے آئے  
صدیق علی ان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور منظم علی نے اسے اپنے قریب  
بٹھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے توقع نہ تھی کہ آج کل تمہیں گھر آنے کی چھٹی ملے گی؟"  
"ابا جان! میں صرف دو دن یہاں ٹھہروں گا۔"  
"تم اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟"

"ابا جان! میں سیدھا کالی کٹ سے آ رہا ہوں۔ میں ماہی کے قریب بحری جنگ میں  
زخمی ہو گیا تھا۔ میرے جہاز پر دو انگریزی جہازوں نے حملہ کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک  
کو ہم نے غرق کر دیا لیکن دوسرے جہاز کی گولہ باری سے ہمارے جہاز کو آگ لگ گئی۔  
ایک فرانسیسی جہاز بروقت ہماری مدد کے لیے پہنچ گیا اور اس نے انگریزی جہاز کو  
بھگا دیا۔ ہمیں اپنا ہتھیار ہوسے جہاز سے ہتھ دھریں اور ناچار فرانسیسی ملاحوں نے ہمیں  
سمندر سے نکال کر اپنے جہاز میں کالی کٹ پہنچا دیا۔ میرے زخم معمولی تھے۔ تاہم مجھے چند  
دن آرام کرنے کی ضرورت تھی۔ ابھی چھ سات روز گزرے تھے کہ انگریزوں نے اچانک  
تیلی جہاز اور ماہی پر قبضہ کر کے کالی کٹ پر حملہ کر دیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی کارگزارانہ  
کے متعلق آپ کے لیے کوئی حوصلہ افزا خبر نہیں لایا ہوں۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں  
کہ جن دو آدمیوں نے سب سے آخر میں کالی کٹ کا قلعہ چھوڑا تھا ان میں سے ایک قلعے  
کا محافظ اور دوسرا میں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری فوج بہت جلد پہنچ جائے گی اور ہم کسی  
تاخیر کے بغیر انگریزوں کو وہاں سے نکال دے گا۔ مسعود اور انور کے متعلق کوئی خبر  
آئی ہے؟"

ان دو بجزیت ہیں۔ انور ان دنوں تہجد پڑھ چکا ہے اور مسعود حیدر علی کے

ساتھ ہے۔ کچھ عرصہ سے میں بھی یہ گوشش کر رہا ہوں کہ مجھے کسی نماز پر بھیج دیا جائے۔  
میں نے شہزادہ بیٹو کو درخواست بھیجی تھی لیکن ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔"  
صدیق علی نے کہا۔ "نہیں ابا جان! اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"  
منظم علی نے کہا۔ "مجھ سے زیادہ حیدر علی کو آرام کی ضرورت تھی۔"  
"لیکن ابا جان! اگر آپ جنگ پر چلے گئے تو یہاں آپ کے حصے کا کام کون  
سنبھالے گا؟"

"یہاں میری جگہ لینے والے اب کئی لوگ موجود ہیں۔"  
تیسرے دن صدیق علی اپنے والدین اور اپنے ننھے بھائی کو حذرًا حذرًا کہہ رہا تھا



ایک رات آسمان صاف تھا۔ منظم علی، فرحت اور مراد علی نانا مغرب کے بعد  
کھلے صحن میں بیٹھے خوشگوار ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ صابرتیزی سے قدم اٹھاتا ہوا  
ان کے قریب آیا اور اس نے کہا۔ "اسد خاں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"  
اسد خاں، منظم علی کے انتہائی بے تکلف دوستوں میں تھا اور اسے چند سال قبل  
ایک لڑائی میں زخمی ہونے کے بعد مرنگا پٹم میں اسلحہ سازی کے کارخانوں کا ناظم بنا  
دیا گیا تھا۔

منظم علی نے صابر سے پوچھا۔ "ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"  
"جی نہیں۔"

منظم علی نے فرحت کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تم ادھر چلی جاؤ میں انہیں یہیں  
بلالیتا ہوں۔"

فرحت اٹھ کر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد صابرا اسد خاں کے ساتھ صحن میں داخل ہوا۔  
منظم علی نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے

پوچھا۔ کیا بات ہے آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں؟  
اسدخال نے جواب دیا۔ مجھے اسی وقت ارکاٹ پہننے کا حکم ملا ہے۔ حیدر علی  
نے سرنگاپٹم کے چند اور افسر بھی اپنے پاس بلا لیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کوئی اہم سسر  
درمیش ہے۔ پر میں مجھے بران الدین کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ نواب صاحب کی  
طبیعت ناساز ہے۔

معظم علی نے پوچھا۔ آپ کب جا رہے ہیں؟  
میں ابھی روانہ ہو جاؤں گا۔ میں صرف آپ سے الوداع کہنے کے لیے آیا تھا۔  
معظم علی نے کہا۔ خدا انھیں صحت دے۔ اس وقت حیدر علی کی صحت سے زیادہ  
میسر کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

اسدخال نے کہا۔ آپ اپنے لڑکوں کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہیں؟  
معظم علی نے جواب دیا۔ حیدر علی کے کیمپ میں شاید آپ کو مسعود علی کے سوا  
کوئی اور نہ ملے۔ صدیق علی ان دنوں منگلور میں ہو گا اور اوزر علی نے مجھے کچھلے ہفتے یہ  
اطلاع بھیجی تھی کہ مجھے تجوز بھیجا جا رہا ہے۔ اگر مسعود علی ملے تو اس سے یہ کہیں کہ گھر سب  
خیریت ہے۔

مراد علی نے کہا۔ چچا جان! بھائی جان سے یہ بھی کہیں کہ وہ چھٹی لے کر چند دن  
کے لیے گھر ضرور آئیں۔ امی انھیں بہت یاد کرتی ہیں۔

معظم علی نے کہا۔ میں نے شہزادہ ٹیپو کو پھیلے ہفتے ایک خط لکھا تھا۔ انہوں نے  
مجھے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ ان کے ساتھ کافی بے تکلف ہیں اگر ممکن ہو تو  
میرے خط کا ذکر ضرور کریں۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ مجھے جنگ میں شریک  
ہونے کی اجازت دی جائے۔

اسدخال نے اٹھ کر مصافحہ کے لیے لاٹھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں ان سے ضرور

سہم اما لیکن مجھے یقین ہے کہ شہزادہ ٹیپو اشد ضرورت کے بغیر آپ کو کسی عمارت پر بھیجنا گوارا  
نہیں کریں گے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ سرنگاپٹم میں زیادہ مفید کام کر رہے ہیں۔  
اسدخال باہر نکل گیا تو مراد علی نے کہا۔ ابا جان! آپ مجھے کب نرانی پر بھیجیں گے؟  
معظم علی نے اسے بازو سے کھینچ کر اپنی گود میں بٹھالیا اور پیار سے اس کے سر پر  
ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بیٹا جب تم نیا ہی بننے کے قابل ہو جاؤ گے تو تمہیں مجھ سے یہ  
پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

مراد علی نے کہا۔ ابا جان! میں یہ سوچتا ہوں کہ جب میں بڑا ہوں گا تو جنگ ختم ہو جائے  
گی۔ پھر ہم لوگ کیا کریں گے؟

معظم علی نے جواب دیا۔ بیٹا! جب جنگ ختم ہو جائے گی تو تم ایک آزاد اور باعزت  
قوم کے مہمراز بنو گے۔ تم ان شہروں اور بستیوں کو دوبارہ آباد کرو گے جو ہماری عزت اور آزادی  
کے دشمنوں کے ہاتھوں ویران ہو چکی ہیں، تمہارے سامنے نہریں کھودنے اور بنجر زمینیں  
آباد کرنے کا کام ہو گا۔ بیٹا تم یہ دعا کیا کرو کہ تمہارے بھائی فتح کے پیر سے اڑتے ہوئے  
گھر واپس آئیں اور تمہارے مقدور میں جنگ کی کلکتوں کی بجائے فتح کے انعامات ہوں۔



میسور کی افواج ارکاٹ سے چند میل دور شمال کی طرف پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی حیدر علی  
علاقت کے باعث ایک نیسے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ٹیپو میسور کی مہم پر روانہ ہونے والے لشکر  
کی صفوں کا معائنہ کرنے کے بعد اپنے باپ کو بڑا حفاظ کہنے کے لیے نیسے میں داخل ہوا۔  
حیدر علی کے اشارے سے طبیب اور تیمار دار باہر نکل گئے اور اس نے ٹیپو کی طرف  
متوجہ ہو کر کہا۔ "فتح علی بیٹھ جاؤ! آج میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ٹیپو اس کے  
بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور حیدر علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ بیٹا تم  
ایک نہایت اہم مہم پر جا رہے ہو۔ ملیسار کی بندرگاہوں کو انگریزوں کے قبضے سے

چھڑانا ضروری ہے۔ جنگ کے متعلق اب میں تمہیں کوئی نصیحت نہیں کر سکتا۔ مجھے تھلاری  
عزیزت، تھلاری شجاعت اور تھلاری ذہانت پر غر ہے۔ ملک کی حکومت اور سیاست کے  
بارے میں تمہیں میری نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔ میں ایک ان پڑھ آدمی ہوں لیکن تم  
اس ملک کے چوٹی کے علماء کی صف اول میں کھڑے ہو سکتے ہو۔ میری زندگی کی سب  
سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میرا بیٹا اپنے زمانے کا بہترین سپاہی، بہترین عالم ادب بہترین  
حکمران ثابت ہو اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری یہ خواہش پوری کر دی لیکن میرے دل  
پر ایک بوجھ ہے۔۔۔۔۔“

حیدر علی یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گیا اور ٹیپو نے کہا۔ ”ابا جان اگر مجھ سے کوئی  
کوٹاہی ہوئی ہے تو آپ کو بتانے میں جھجک محسوس نہیں ہوتی چاہیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں  
کہ میں اپنی اصلاح کروں گا۔“

حیدر علی نے جواب دیا۔ ”نہیں بیٹا! تم نے ہمیشہ میری بلند ترین توقعات پوری کی ہیں۔  
مجھے صرف یہ امنوس ہے کہ میں اپنے حصے کا کام پورا کر سکا۔ میں اپنی موت سے پہلے ہندوستان  
کو انگریزوں سے پاک دیکھنا چاہتا تھا لیکن اب شاید میری یہ خواہش پوری نہ ہو۔“

ٹیپو نے منگوم لہجے میں کہا۔ ”ابا جان آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔“  
حیدر علی نے محبت بھری نگاہوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”ٹیپو! ممکن  
ہے کہ میں چند دن تک تندرست ہو جاؤں اور تھلاری مدد کے لیے ملیبار پٹیوں لیکن  
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔ اس لیے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، غور  
سے سو۔ میری زندگی کی دوسری ناکامی یہ ہے کہ میں نظام اور مرہٹوں کو راہ راست  
پر نہ لاسکا۔ انگریز ہمارے اس لیے دشمن ہیں کہ ہم ان کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کا  
سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ نمرٹے ہمارے اس لیے مخالفت ہیں کہ وہ مغلیہ  
سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان کو اپنی شکار گاہ سمجھتے ہیں اور انہیں کسی دوسری

طاقت کا ابھرنے والا نہیں۔ نظام ہمارا ایک طاقت ور صلیف بن سکتا تھا لیکن وہ ان اپنا  
کے ہاتھ میں ایک کھولتے ہوئے جینس ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے ساتھ کوئی  
دلچسپی نہیں۔ فرانسیسی اس وقت بیشک ہمارے ساتھ ہیں لیکن ہمیں یہ سمجھنے کی غلطی  
نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ہمیشہ ہمارے دوست رہیں گے۔ وہ محض اپنی انگریز دشمنی کے  
باعث ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہیں لیکن اگر کسی وقت انگریزوں کے ساتھ ان کی مصالحت  
ہوگی تو وہ ہمیں تنہا چھوڑ دیں گے۔ حیدر علی کی حیثیت اب نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں  
اس کی دوستی یا دشمنی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ انگریزوں کی بساط سیاست کا ایک  
پٹا ہوا مرہ ہے اور اگر ہم نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا تو ایسے بے ضمیر آدمی  
کے لیے اس ملک میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ میں نے اپنی زندگی کے بیشتر لمحات لڑائی  
کے میدانوں میں گزارے ہیں لیکن ابھی تک اس جنگ کا فیصلہ نہیں ہوا ہے جس پر اس  
ملک کی آزادی کا دار و مدار ہے۔ میرے بعد یہ جنگ تمہیں لڑنی پڑے گی لیکن میسرور میں  
ابھی اجتماعی خصوصیات کا فقدان ہے جو ایک طویل اور صبر آغا جنگ سے عہدہ برآ ہونے  
کے لیے ضروری ہیں۔ تم میسرور کو ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری حصار بنانا چاہتے ہو اور  
یہ امید رکھتے ہو کہ مسلمان عوام تھلاری آواز پر لبیک کہیں گے لیکن مجھے یہ اندازہ ہے کہ تمہیں  
عوام سے پہلے ان خود غرض اور بد طینت اراکے سے سابقہ پڑے گا جو اسلام کے نعرہ کو اپنے  
اقتدار کے خلاف اعلان جنگ سمجھتے ہیں۔“

ٹیپو نے جواب دیا۔ ”ابا جان! اگر ہندوستان کے مسلمان اپنی بے راہ روی کے  
باعث منضوب قوم نہیں بن چکے ہیں اور قدرت انہیں سنبھالنے کا کوئی موقع دینا چاہتی  
ہے تو وہ ہماری آواز پر لبیک کہیں گے اور ہماری آواز پر وہ غیر مسلم بھی لبیک کہیں گے  
جو اس ملک کو انگریزوں کی غلامی سے بچانا چاہتے ہیں لیکن اگر وہ خود کسی کا ارادہ ہی کر چکے ہیں  
تو ہمارے مقدر میں انگریزوں کی غلامی نہیں ہوگی۔ ہم اس مقصد کے لیے قربان ہو جائیں



گے جو ہماری ذات سے بہت بلند ہے ہماری فتح انسانیت کی فتح ہوگی اور ہماری شکست ان لوگوں کی شکست ہوگی جنہوں نے ذلت کا اتر اختیار کیا ہے؟

حیدر علی نے کہا: "میتا میں تمیں یا لوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں صرف میرا نام چاہتا تھا کہ تمہارے رستے میں کتے دریا اور کتے پہاڑ ہیں اور تمہیں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے کتے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ تمہارے لیے خدمت سبھوں کی سیج نہیں بلکہ کاتوں کا بستر ہوگی۔"

ٹیپو نے کہا: "اباجان! میسور کے حکمران کو خدا سلامت رکھے، اس وقت میں آپ کی فوج کا ادنیٰ سپاہی ہوں اور یہ اعزاز میرے لیے کافی ہے کہ میں ملیبار کے محاذ پر آپ کی توقعات پوری کر سکوں۔"

حیدر علی نے کہا: "میں اپنی ہر سانس کے ساتھ تمہارے لیے دعا کیا کرتا ہوں۔ شہزادہ ٹیپو نے کہا: "اباجان! آپ کو طبیعوں کے مشوروں پر سختی سے عمل کرنا چاہیے۔ ان سب کی ہی رائے ہے کہ تندرست ہونے سے پہلے آپ کے لیے سفر ٹھیک نہیں ہوگا۔"

حیدر علی مسکرایا: "میرے طبیعوں کے مشوروں پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا لیکن اب اگر وہ یہ مشورہ نہ دیتے تو بھی میرے لیے بستر پر لیٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

اباجان! آپ بہت جلد تندرست ہو جائیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

حیدر علی نے مصلحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "میتا جاؤ تمہارے ساتھ جو!"

تھوڑی دیر بعد بیس ہزار آدموں کے ساتھ سپاہیوں کی فوج ملیبار کا رخ کر رہی تھی۔

ماہ نومبر کے تیسرے ہفتے شہزادہ ٹیپو کی افواج ملیبار میں رام گل کے دروازے

پر دستک دے رہی تھیں۔ ہمبر اسٹون کی قیادت میں انگریزی فوج ان کی آمد کی اطلاع ملے ہی رڈ چکر ہو چکی تھی۔ ٹیپو نے اس کا پیچھا کیا اور رام گل سے چند میل کے فاصلے پر اسے جالیا۔ ہمبر اسٹون نے شیر میسور کا مقابلہ کرنے کی بجائے بھاگنا زیادہ مناسب سمجھا۔ رات کے وقت ہمبر اسٹون کی فوج نے دریا عبور کرنے کے بعد پونانی کا رخ کیا۔ اس عرصہ میں کرنل میکوڈ کی کمان میں انگریزوں کی ایک اور فوج ہمبر اسٹون کی مدد کو پہنچ چکی تھی۔ ٹیپو، پونانی کے گرد گھیرا ڈال کر فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے حیدر علی کی وفات کی خبر ملی:

## انیسواں باب

مدرا اس کا گورنر اپنے دفتر میں جنرل اسٹورٹ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک لفتتہ کھلا ہوا تھا۔ گورنر کا میکروٹری، نواب محمد علی والا جاہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ گورنر اور جنرل اسٹورٹ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ محمد علی نے جھک کر انہیں سلام کیا اور مصافحہ کرنے کے بعد گورنر کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ محمد علی کے چہرے سے امدت اور سریشی کی بجائے بھوک اور حرص اور مردانہ وجاہت کی بجائے لومڑی کی سی عیبیاری اور سفہ پن مترشح تھا۔ اس کا بھاری عمامہ اور قیمتی جبے اس کی شان و شوکت میں اضافہ کرنے کی بجائے اس پر ایک غیر ضروری بوجھ معلوم ہوتا تھا۔

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی گورنر سے مخاطب ہو کر کہا: "صنور والا! ابھی تک جنرل اسٹورٹ یہیں ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہم یہ موقع کھو بیٹھیں گے۔ خدا کے لیے دیر نہ کیجئے۔ سرنگاپٹم میں ہمارے دوست آپ کی فرج کی راہ دکھ رہے ہوں گے۔ دشمن کو سنبھلنے کا موقع دینا دانشمندی نہیں۔"

گورنر نے ایک تعارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ محمد علی کی طرف دیکھا اور کہا: "نواب صاحب! ڈن کو گورنر یا احمق سمجھ لینا بھی دانشمندی نہیں۔"

محمد علی نے جواب دیا: "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی اطلاعات غلط ہیں۔ ٹیپو کے خلاف آپ کے دوستوں

کی سازش کا میاب نہیں ہوئی۔ وہ سب گرفتار ہو چکے ہیں اور وہ سلطنت پر قبضہ جما چکا ہے۔"

محمد علی چٹختی پھیسی آنکھوں سے گورنر، اس کے سیکرٹری اور جنرل اسٹورٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "جناب والا اگر آپ کی فرج حیدر علی کی موت کی اطلاع پلستے ہی سرنگاپٹم کی طرف کوچ کر دیتی تو باغیوں کے حوصلے بلند ہو جاتے اور ٹیپو کو تخت پر بیٹھنے کا موقع نہ ملتا۔"

جنرل اسٹورٹ نے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ ہم نے ایسی حماقت نہیں کی ورنہ ہماری تباہی یقینی تھی۔"

"لیکن ٹیپو کو اطمینان سے تیاری کا موقع دینا ایک غلطی ہے۔ اگر آپ سرنگاپٹم کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے تیار نہیں تو کرناٹنگ کے مقبوضہ علاقوں سے میسور کی فرج کو نکالنے میں آپ کو کون سی مشکل درپیش ہے؟"

جنرل اسٹورٹ نے جواب دیا: "سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم فوری حملے کے لیے تیار نہیں اور میسور کے سپاہی آپ کی خواہشات کا احترام کرنے کی بجائے ہر قدم پر مزاحمت کریں گے۔"

"تو پھر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ میں حیران ہوں کہ آپ جیسا بہادر اور تجربہ کار جنرل، ٹیپو سے اتنا مرعوب ہے۔"

جنرل اسٹورٹ کا چہرہ غصے سے ٹھنخ ہو گیا۔ تاہم اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا: "نواب صاحب ہم جانتے ہیں کہ آپ ٹیپو کے متعلق بہت پریشان ہیں لیکن وہ ایک طاقت ور اور ہوشیار دشمن ہے اور ہم پوری تیاری کے بغیر میسور پر حملہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اگر وہ آپ کی طرح محض ایک نواب ہوتا تو میں اور میرے سپاہی آنکھوں پر پٹیوں باندھ کر سرنگاپٹم کی طرف لینا کر دیتے لیکن وہ

کمپنی کے حکام اور انگریزوں کی تری و بحری فوج کے جنرل اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے کہ سرنگا پٹم پہنچنے کا آسان ترین راستہ کون سا ہے۔ سلطان ٹیپو حکومت اور فوج کا نظم و نسق درست کرنے میں مصروف تھا کہ اسے دنڈی دیش کی طرف جنرل اسٹورٹ کی پیشقدمی کی اطلاع ملی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ معلوم ہوا کہ پونانی سے جنرل میکوڈ کی افواج بڈور کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ انگریزوں کی تیسری فوج جنرل میتھیوز کی کمان میں تھی۔ وہ ادو کے آس پاس ملیبار کے چند ساحلی مقامات پر قبضہ کر چکا تھا اور اس کی تجویز یہ تھی کہ بڈور کی طرف پیشقدمی کرنے سے پہلے عقب سے رسد اور ملک کے راستے محفوظ کرنے کے لیے ملیبار کے تمام ساحلی علاقوں پر قبضہ کر لیا جائے لیکن مدراس اور بمبئی کی حکومتیں بڈور کی طرف فوری پیشقدمی کرنے کے لیے مہتممیں اور اس کی دہر تھی کہ بڈور کا صوبہ سیو کی سلطنت کا زرخیز ترین علاقہ تھا اور کمپنی کو یہاں آسانی رسد کا سامان مل سکتا تھا اور اس کے علاوہ علاقہ ساحل سے زیادہ دور تھا اور انگریز اپنی بحری طاقت سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے تھے بمبئی اور مدراس کی حکومتوں کو یہ یقین تھا کہ بڈور کا زرخیز علاقہ خطرے میں دیکھ کر سلطان ٹیپو کمپنی کی شرائط پر صلح کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔

سلطان ٹیپو کو بڈور کی دفاعی قوت پر اعتماد تھا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے انگریزوں کی ان افواج کی طرف توجہ دی جو جنرل اسٹورٹ کی کمان میں دنڈی دیش کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ۱۳ فروری کو سلطان ٹیپو نے جنرل اسٹورٹ کو دنڈی دیش کے قریب جالیا فرانسیسی دستے اس کے ساتھ تھے جن کی رہنمائی کا سگنی کر رہا تھا۔ سلطان کے لشکر کی شدید گولباری نے جنرل اسٹورٹ کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ جنرل اسٹورٹ کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ اس نے دنڈی دیش اور کرنلی کے قلعے بارود سے اڑا دیئے تاکہ میسور کی افواج اسلحہ اور رسد کے ذخائر سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ پھر ناگ کے میدانوں پر ایک بار پھر دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے اور جنرل اسٹورٹ کی پسپائی سے مدراس میں کمپنی کے ایوانوں میں زلزلہ

مٹھ سا ہی ہے اور اگر آپ کو اپنی سلطنت کا بیشتر حصہ کھو بیٹھنے کے بعد بھی اس کی قابلیت کے متعلق کوئی شبہ ہے تو میں مشورہ دینے کی بجائے خود سرنگا پٹم کا رخ کیجئے۔ اسٹورٹ کا خیال تھا کہ محمد علی آپ سے باہر ہو جائے گا لیکن اسے یالوسی ہوئی۔ محمد علی کے چہرے پر ایک فزویانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جنرل اسٹورٹ حیران تھا لیکن انگریز گورنر اور اس کے سکریٹری کے لیے یہ مسکراہٹ کوئی نئی بات نہ تھی۔ محمد علی کرناٹک کا حکمران بننے کے بعد ہر انگریز کی گالیوں پر مسکرائے کا عادی ہو چکا تھا۔

گورنر نے جنرل اسٹورٹ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "نواب صاحب اس ملک میں ہمارے بہترین دوست ہیں اس لیے ان کی پریشانی بلا دو نہیں۔" گورنر کے ان الفاظ سے محمد علی کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جس کا باپ اسے تھپتھپانے کے بعد سبب دکھا کر خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے کہا: "جناب جنرل صاحب بہادر! میرا مطلب یہ تھا کہ میسور پر ایک کاری طلب لگانے کے لیے یہ بہترین موقع ہے اور ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" جنرل اسٹورٹ نے جواب دیا: "نواب صاحب آپ مطمئن رہیں ہم تیاری کر رہے ہیں اور ایک ماہ تک ہم میسور پر چڑھائی کر سکیں گے۔" "مجھے یقین ہے کہ آپ کو فتح ہوگی۔"

گورنر نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "نواب صاحب! ہمیں آپ کے مشوروں سے زیادہ آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

تھوڑی دیر بعد نواب محمد علی وانا جاہ گورنر کے کمرے سے باہر گورنر کے اردلیوں بیروں، خانساموں اور چہرا سوں کو روپے تقسیم کر دیا تھا اور وہ اسے مبارکباد پیش کر رہے تھے جب

ٹیپو نے عمان حکومت اس وقت سنبھالی جب مدراس، کلکتہ اور بمبئی میں الیٹ

آج کا تھا۔

لیکن اس عرصہ میں بڑوں میں ایک غیر متوقع صورت حالات پیدا ہو چکی تھی۔ سات سمندر پار کے تاجروں کی نگاہیں ایک ایسے ملت فروش کو تلاش کر چکی تھیں جس کی غداری ان کی توپوں اور ہتدوقوں سے زیادہ موثر ثابت ہوئی۔ یہ غدار حیدر علی کا لے پاک ایاز خاں تھا۔



منگلور کی بندرگاہ پر کشتیوں کے ذریعے ایک چھوٹے سے جہاز پر اسلو اور بارود لادا جا رہا تھا۔ صدیق علی خاں بندرگاہ پر ایک فوجی افسر سے باتیں کر رہا تھا۔ ایک خوش پوش آدمی جس کی عمر پچاس سال سے اوپر معلوم ہوتی تھی ہانتپتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس نے سوال کیا۔ "آپ کا نام صدیق علی خاں ہے؟"

"جی ہاں! ذمہ داری ہے۔"

"آپ اس جہاز کے کپتان ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"یہ جہاز کتنا پورا جا رہا ہے؟"

"جی۔"

عمر رسیدہ آدمی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے ابھی اطلاع ملی تھی خدا کا شکر ہے کہ وقت پر پہنچ گیا ہوں۔"

صدیق علی نے کہا۔ "ذمہ داری آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟"

نودار نے جواب دیا۔ "ہم آپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔"

سعادت کیجیے یہ جہاز ایک فوجی ہم پر جا رہا ہے اور مسافروں کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔"

نودار نے اطمینان سے کہا۔ "میں فوجیوں سے مل چکا ہوں۔ وہ خود بھی یہاں

آ رہے ہیں۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ آپ ان کا انتظار کریں!"

چار کمانڈر ایک خوبصورت پاکی اور ان کے پیچھے چند آدمی سامان کے صندوق اٹھائے نمودار ہوئے۔ عمر رسیدہ آدمی صدیق علی کو جبران اور پریشان چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے کشتیوں کے قریب پاکی اور سامان اترا دیا۔

ایک سیاہ نام عورت جو اپنے لباس سے خادوم معلوم ہوتی تھی۔ پاکی کے قریب کھڑی تھی۔ فوجی افسر نے صدیق علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا سفر بہت دلچسپ رہے گا۔"

صدیق علی نے کہا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ یہ بڑے میاں اپنے پورے خاندان کے ساتھ میرے جہاز پر سوار ہوں گے؟"

"جی ہاں! اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ کو اپنے جہاز کا بہترین حصہ ان کے لیے

خالی کرنا پڑے گا۔ وہ دیکھیے فوجی صاحب بھی تشریف لارہے ہیں!"

"لیکن یہ بزرگ ہیں کون؟"

"یہ یہاں کے ایک مشہور تاجر ہیں ان کا نام ناصر الدین ہے۔ پہلے ان کا مرکز

کالی کٹ تھا۔ وہاں سے انگریزوں کے حملے کے باعث سخت نقصان اٹھانے کے

بعد یہاں آگئے تھے۔ بڑوں کے صوبیدار کے ساتھ ان کے گھرے مراسم ہیں اور پچھلے

دنوں میں نے سنا تھا کہ وہاں ان کے بیٹے کو فوج میں کوئی اچھی ملازمت بھی مل گئی ہے۔"

منگلور کا فوجی صوبیدار صدیق علی کی عزت بڑھا۔ فوجی افسر اسے سلام کرنے کے بعد

ایک طرف ہٹ گیا۔

فوجیوں نے صدیق علی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں آپ کو ایک اور ذمہ داری

سونپنے آیا ہوں۔"

فرمائیے؟

فوجدار نے ناصر الدین کی طرف، جواب کہا زوں اور مزدوروں کو پیسے بانٹنے میں مصروف تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا: "آپ ان سے مل چکے ہیں؟"

"جی ہاں! لیکن میں حیران ہوں کہ ان کے خاندان کے لیے میرے جہاز میں کہاں جگہ ہوگی؟"

فوجدار نے کہا: "یہ ایک مجبوری ہے۔ یہ بڈفورڈ کے گورنر کے درست ہیں اور وہاں اپنے لڑکے کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ گورنر نے پچھلے ہفتے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ میں انہیں جہاز پر کھڑا کر دینا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ سواریوں کے جہاز کا انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ میں نے انہیں کہا ہے کہ فوجی جہاز پر آپ کو تکلیف ہوگی لیکن وہ بے حس ہیں اور اگر میں آپ کو یہ بتا دوں کہ یہ بے حس کیوں ہوں تو آپ یہ نہیں کہیں گے کہ فوجی جہاز پر عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

"مجھے ان کی حسد سے کوئی بھتہ نہیں۔ بہر حال مجھے آپ کا حکم ماننا پڑے گا۔"

فوجدار نے کہا: "اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ ان کی صاحبزادی، بڈفورڈ کے گورنر کی بیوی بننے کے لیے وہاں جا رہی ہیں تو میں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔"

ایک گھنٹہ بعد جہاز کے بادبان کھولے جا چکے تھے۔ ناصر الدین کے ساتھ اس کی بیٹی کے علاوہ ایک خادمہ اور دو نوکر تھے۔ صدیق علی نے انہیں اپنے کمرے میں جگہ دیتے ہوئے کہا: "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اس جہاز پر اس سے بہتر جگہ نہیں مل سکتی۔ آپ نے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ ان دنوں بحری سفر خطرے سے خالی نہیں۔ انگریزوں کے جنگی جہاز ہمارے ساحل کے آس پاس گھوم رہے ہیں۔"

ناصر الدین نے بے اعتنائی سے جواب دیا: "یہ ایک مجبوری ہے ورنہ میں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔"

اگلے روز شام سے کچھ دیر پہلے ناصر الدین کی لڑکی نے اسے گری نینڈ سے جگایا

"آبا جان! آبا جان!"

ناصر الدین نے آنکھیں ملے ہوئے شکایت کے لہجے میں کہا: "بیٹی تمہیں معلوم ہے کہ گزشتہ رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی اور اب بھی میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ نہیں سویا۔"

لڑکی نے کہا: "آبا جان آپ پر سے پانچ گھنٹے سوئے ہیں، دیکھیے اب شام ہو رہی ہے۔ آبا جان صلاح شور مچا رہے ہیں، خادمہ کہتی ہے کہ جہاز کا کپتان آنکھوں سے دیرین لگائے کھڑا تھا۔"

ناصر الدین نے برہم ہو کر کہا: "یہ کون سی نئی بات ہے۔ جہاز کے کپتان ہمیشہ دور میں لگا کر دیکھا کرتے ہیں۔"

"لیکن خادمہ کہتی ہے، اس نے دور کوئی جہاز دیکھ کر ملاحوں کو خبر دانا نہیں کہا۔ حکم دیا ہے! "

"خادمہ کہاں ہے؟"

"میں نے اسے دوبارہ پتہ کرنے کے لیے بھیجا ہے، خدا کے لیے آپ بھی جا کر پتہ کر آئیں۔"

ناصر الدین نے کہا: "بیٹی اگر کوئی خطرے کی بات ہوتی تو کپتان ہمیں خود آکر بتاتا۔"

صدیق علی دروازے میں نمودار ہوا اور اس نے کہا: "آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔"

"خیر تو ہے؟" ناصر الدین نے گہرا کر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ناصر الدین کمرے سے باہر نکلا اور صدیق علی نے اسے چند قدم دور لے

خشکی کے راستے آپ کے باقی سفر کا انتظام کر دیں گے۔  
لڑکی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "لیکن ہم کشتی پر نہیں جائیں گے۔ میں کشتی پر  
سوار ہونے کی بجائے جہاز پر رہنا زیادہ بہتر سمجھتی ہوں۔"

صدیق علی نے کہا۔ "شاید میں نے آپ کے سامنے صورتِ حالات کا صحیح نقشہ  
پیش نہیں کیا۔ میں نے آپ کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ  
انگریزی جہاز جو میں نے دیکھا ہے، تنہا نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ صبح تک ایک دو اور جہاز  
ہمارے مقابلے پر آجائیں۔ اس صورت میں آپ کی حفاظت کا مسئلہ میرے لیے  
انتہائی پریشان کن بن جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر  
اپنی منزل تک پہنچ جائیں لیکن میں خطرات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔"

لڑکی نے کہا۔ "اس جہاز پر سوار ہوتے وقت ہمیں کسی نے یہ نہیں بتایا تھا  
کہ آپ جب چاہیں ہمیں راستے میں اتار سکتے ہیں۔ اگر آپ ہمیں آگے نہیں لے جانا  
چاہتے تو ہمیں واپس منگلوڑ پہنچا دیجیے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "معاف کیجیے میں آپ کے ساتھ بحث میں نہیں الجھنا چاہتا  
میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس جہاز میں کسی مسافر کو جگہ دینا میری غلطی تھی۔"

ناصر الدین نے صدیق علی کا لب و لہجہ دیکھ کر ذرا مداخلت کی ضرورت محسوس کی  
اور کہا۔ "رضیہ، پیمان صاحب ہمارے فائدے کی بات کہہ رہے ہیں۔ یہ منگلوڑ سے  
ہی ہمیں اس جہاز پر جگہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔"

رضیہ بولی۔ "لیکن پیمان صاحب کو یہ حق نہیں کہ وہ ہمیں منگلوڑ سے لاکر کسی  
دیران جگہ پر اتار دیں۔"

ناصر الدین نے صدیق علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "پیمان صاحب! بات دراصل  
یہ ہے کہ ہم کسی تاخیر کے بغیر ٹر نوڈر پہنچنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس ٹر نوڈر کے صوبیدار

جا کر کہا۔ "میں آپ کی صاحبزادی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے دوپہر کے  
وقت ایک جہاز دیکھا تھا لیکن اس وقت وہ کافی دور تھا اور میرے لیے یہ جاننا مشکل  
تھا کہ وہ انگریزی ہے یا فرانسیسی۔ اب اس پر انگریزوں کا جھنڈا صاف دکھائی دے  
رہا ہے۔ رات آ رہی ہے۔ ہمیں چند گھنٹوں کے لیے کوئی خطہ نہیں لیکن اس بات  
کا بہت امکان ہے کہ صبح ہوتے ہی ہم دشمن کی توپوں کی زد میں ہوں۔ اس لیے  
میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کشتی میں ساحل پر پہنچا دیا جائے۔"

زوجان لڑکی اپنے چہرے پر نقاب ڈالے کرے سے باہر نکلی اور اس نے  
کہا۔ "اباجان! کیا بات ہے؟"

ناصر الدین نے جواب دیا۔ "مٹی پریشانی کی کوئی بات نہیں، جاؤ بیٹھو!"  
لڑکی نے کہا۔ "اگر کوئی خطرہ ہے تو میں جاننا چاہتی ہوں۔"

ناصر الدین نے پریشان ہو کر صدیق علی کی طرف دیکھا اور اس نے کہا۔ "دیکھیے  
مجھے ڈر ہے کہ صبح تک ہمارے جہاز پر انگریزی جہاز حملہ نہ کر دے۔ اس لیے میں  
نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو راتوں رات ساحل پر پہنچا دیا جائے۔ ساحل یہاں سے  
زیادہ دور نہیں اور اس علاقے میں جگہ جگہ ہماری چکیاں ہیں اور کسی چوکی سے بھی  
آپ کے لیے گھوڑوں، کاندولست ہو سکتا ہے۔"

لڑکی نے کہا۔ "اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ راستے میں رونا چاہتے ہیں تو  
ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم گھوڑوں پر سفر کرنے کی بجائے آپ کے ساتھ  
رہیں گے۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "میں چند منٹ کے لیے بھی نہیں رک سکتا۔ میرا کام  
کنڈاپورا ساحل پہنچانا ہے۔ میں اس کشتی کا انتظام بھی نہیں کروں گا۔ جو آپ کو ساحل تک  
پہنچانے جائے گی۔ میرے جو ملاح آپ کے ساتھ جائیں گے وہ ساحل کی کسی چوکی سے

کے دو پیغامات آپکے ہیں اور انہوں نے منگور کے قلعہ دار کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ ہمارے سفر کا فدی انتظام کر دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ کنڈاپور کی بندرگاہ پر میرا لڑکا ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔“

صدیق علی کچھ کنا چاہتا تھا کہ ایک ملاح تیزی سے قدم اٹھاتا ہو اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا: ”جناب معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی جہاد ہم سے کتنا اگر جنوب کا رخ کر رہا ہے۔“

صدیق علی کچھ کے بغیر جہاز کے عرش کی طرف بڑھا اور دو دہائیوں کے قریب لگا کر انگریزی جہاز کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مڑ کر دیکھا تو ناصر الدین اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

صدیق علی نے کہا: ”معلوم ہوتا ہے کہ خطہ ٹل گیا ہے۔ آپ اپنی صاحبزادی کو تسلی دیں۔“

رات کے وقت ناصر الدین رضیہ سے یہ کہہ رہا تھا: ”بیٹی! تمہیں کپتان کے ساتھ اس قدر زیادتی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ سرگاکاٹم کے ایک نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ میں اس کے والد کو جانتا ہوں وہ میسور کی فوج کا ایک قابل قدر افسر ہے۔“

رضیہ نے کہا: ”ابا جان! اسے بیتابنا چاہتی تھی کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ جب وہ آپ کے پاس آیا تھا تو میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔ پھر جب اس نے آپ کے ساتھ ملحدگی میں بات کرنے کی کوشش کی تو میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ شاید میرے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ میں کوئی خطرناک خبر سنتے ہی چینیں مارنا شروع کر دوں گی، اگر وہ اپنے اختیارات کا مظاہرہ کرنے کی بجائے ہمیں نرمی سے سمجھاتا تو شاید میں کشتی پر سوار ہونے کے لیے تیار بھی ہو جاتی۔ اس کا طرز گفتگو میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔“

ناصر الدین نے کہا: ”مجھے معلوم ہے کہ تمہارا مقصد صرف اسے چرانا تھا اور نہ تمہارا چہرہ بتا رہا تھا کہ جب کشتی اتاری جائے گی تو تم مجھ سے پہلے اس میں سوار ہونے کی کوشش کر دو گی اور میں یہ بھی کہوں گا کہ اس کی گفتگو نہایت شائستہ تھی۔ بہر حال میں نے تمہاری طرف سے معذرت کر دی ہے۔“

”آپ نے یہی کہا ہوگا کہ میں بہت خندی ہوں؟“  
”نہیں! میں نے یہ کہا تھا کہ تم کشتی پر سوار ہونے سے ڈرتی ہو گی۔“

اس کے بعد راستے میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا اور ایک دن علی الصبح صدیق علی کا جہاز کنڈاپور کی بندرگاہ میں کھڑا تھا۔ قلعے کے سپاہی اور جہاز کے ملاح کشتیوں پر سامان اتارنے میں مصروف تھے۔

رضیہ نے اپنے باپ کو جگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ”ابا جان! اٹھیے! شاید بندرگاہ آگئی ہے۔“

”دیکھو بیٹی! مجھے تنگ نہ کر دو۔ باپ نے یہ کہتے ہوئے کروٹ بدلی اور دوبارہ سو گیا۔“

رضیہ نے دوبارہ اس کا بازو جھنجھوٹتے ہوئے کہا: ”ابا جان دیکھیے! شاید کنڈاپور آ گیا ہے۔“

باپ نے ملتی ہو کر کہا: ”خدا کے لیے مجھے سونے دکنڈاپور ابھی بہت دور ہے۔“  
رضیہ مایوس ہو کر کہے سے باہر نکل گئی۔

صدیق علی عرش پر کھڑا سامان اتارنے والے سپاہیوں اور ملاحوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ رضیہ کچھ دیر اس سے چند قدم دور کھڑی بندرگاہ کی طرف دیکھتی رہی۔ آنکھوں کے سوا اس کا باقی چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ صدیق علی نے ایک بار اس کی طرف

”ابا جان! آپ نے اس نیم پاگل آدمی سے یہ کیوں کہا تھا کہ میں کشتی پر سوار ہونے سے ڈرتی ہوں؟“

ناصر الدین نے اٹھ کر بیٹھے ہوئے کہا: ”معلوم ہوتا ہے آج تم مجھے بالکل نہیں سونے دو گی۔“

تھوڑی دیر بعد ناصر الدین، رضیہ اور ان کی خادمہ اور نوکر ایک کشتی پر سوار ہو کر بندرگاہ کا رخ کر رہے تھے اور صدیق علی خاں ان کے پیچھے دوسری کشتی میں سوار تھا، دونوں کشتیاں ایک ساتھ ساحل پر لگیں۔ کنڈاپور کا قلعہ دار چند امروں اور سپاہیوں کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر پہلے ناصر الدین اور پھر رضیہ کو سارا دے کر کشتی سے اتارا۔ قلعہ دار، صدیق علی سے مصافحہ کرنے کے بعد ناصر الدین کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے کہا: ”ہم نے آپ کے سفر کا انتظام کر لیا ہے۔ چلیے پہلے قلعہ میں نائٹا کر لیجیے۔“

ناصر الدین نے صدیق علی کو اس نوجوان کی طرف جو چند قدم پیچھے رضیہ کے پاس کھڑا تھا متوجہ کرتے ہوئے کہا: ”کیا ان صاحب یہ میرا بیٹا افتخار الدین ہے؟“

افتخار الدین نے آگے بڑھ کر مجبوشی کے ساتھ صدیق علی سے مصافحہ کیا۔

قلعہ دار نے اپنے سپاہیوں سے کہا: ”ان کا سامان قلعے میں لے چلو۔“

افتخار الدین نے قلعہ دار سے کہا: ”لیکن ہم کھانا کھاتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

ناصر الدین نے احتجاج کیا: ”نہیں نہیں! کھانا کھانے کے بعد میں آرام

کردں گا۔ اب ہمیں کوئی جلدی نہیں۔“

سپاہیوں نے سامان اٹھالیا اور ناصر الدین اور اس کے ساتھی ان کے پیچھے قلعے

کی طرف چل دیئے۔

دیکھا اور بے توجہی سے منہ پھیر لیا۔ جہاز پر پہلی گفتگو کے بعد وہ حتی الوسع اس سے دھڑکنے کی کوشش کرتا تھا۔ رضیہ کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑی رہی۔ بالآخر حیرت کر کے آگے بڑھی اور صدیق علی کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی: ”یہ کنڈاپور ہے؟“

”جی ہاں! ہم رات کے تیسرے پہر یہاں پہنچ گئے تھے۔“

”کوئی ہمارے متعلق پوچھنے نہیں آیا؟ مجھے یقین ہے کہ میرا بھائی ضرور

آیا ہوگا۔“

ممکن ہے آپ کا بھائی بندرگاہ پر کہیں ٹھہرا ہوا ہو۔ میرا خیال ہے کہ کسی کو

اس جہاز پر آپ کی آمد کی توقع نہیں ہو سکتی۔“

رضیہ نے قدرے توقف کے بعد کہا: ”خدا کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے پہنچ گئے، ورنہ آپ تو ہمیں راستے میں ہی دھکا دینے پر آمادہ تھے۔“

صدیق علی نے کہا: ”بعض ذرائع بہت ناخوشگوار ہوتے ہیں اور یہ ان میں سے

ایک تھا۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ آپ تکلیف سے بچ گئیں۔ اب آپ تیاری کریں

آپ کے لیے کشتی تیار ہے۔ میں نے قلعہ دار کو آپ کی آمد کی اطلاع بھیج دی ہے۔

شاید وہ آپ کے استقبال کے لیے پہنچ جائے۔“

رضیہ نے کہا: ”اس دن شاید آپ کو میری باتیں ناگوار محسوس ہوتی تھیں۔ میرا

یہ ارادہ تھا کہ کنڈاپور پہنچ کر آپ سے معذرت کروں گی۔“

صدیق علی نے بے پروائی سے جواب دیا: ”باتوں میں شاید میں نے بھی آپ کے

ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ آپ شام کے وقت کشتی پر سوار

ہونے سے ڈرتی ہیں۔“

”جی یہ بالکل غلط ہے۔“ رضیہ یہ کہہ کر صدیق علی سے زیادہ اپنے باپ کو کوستی ہوئی

کرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ناصر الدین کو بازو سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ کہہ رہی تھی۔



قلعہ دار نے صدیق علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ انہیں لے آئے۔ صوبیدار صاحب مجھ سے بہت برہم تھے۔ چند دن قبل انہوں نے یہ حکم بھیجا تھا کہ انہیں لانے کے لیے ایک خاص جہاز بھیج دیا جائے۔ جہاز سے یہاں کوئی جہاز موجود نہ تھا۔ پھر ان کا دوسرا حکم آیا کہ منگور کے فوجدار کو ان کے سفر کا انتظام کرنے کا حکم بھیجا جا چکا ہے، اس لیے یہاں سے خاص جہاز بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا سا جزاہ ایک ہفتے سے ان کا یہاں انتظار کر رہا تھا لیکن کل صبح ان کا تیسرا حکم آیا کہ اب سمندر کا راستہ خطرناک ہے، اگر وہ سپین نہیں گئے تو تم تنگی کے راستے چند سپاہی بھیج کر منگور کے فوجدار کو یہ ہدایت کر دو کہ انہیں سمندر کے بجائے خشکی کے راستے بھیجنے کا انتظام کیا جائے اور میں نے یہ حکم ملتے ہی چند سواری منگور کی طرف روانہ کر دیئے تھے۔"

قلعہ دار نے صدیق علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ انہیں لے آئے۔ صوبیدار صاحب مجھ سے بہت برہم تھے۔ چند دن قبل انہوں نے یہ حکم بھیجا تھا کہ انہیں لانے کے لیے ایک خاص جہاز بھیج دیا جائے۔ جہاز سے یہاں کوئی جہاز موجود نہ تھا۔ پھر ان کا دوسرا حکم آیا کہ منگور کے فوجدار کو ان کے سفر کا انتظام کرنے کا حکم بھیجا جا چکا ہے، اس لیے یہاں سے خاص جہاز بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا سا جزاہ ایک ہفتے سے ان کا یہاں انتظار کر رہا تھا لیکن کل صبح ان کا تیسرا حکم آیا کہ اب سمندر کا راستہ خطرناک ہے، اگر وہ سپین نہیں گئے تو تم تنگی کے راستے چند سپاہی بھیج کر منگور کے فوجدار کو یہ ہدایت کر دو کہ انہیں سمندر کے بجائے خشکی کے راستے بھیجنے کا انتظام کیا جائے اور میں نے یہ حکم ملتے ہی چند سواری منگور کی طرف روانہ کر دیئے تھے۔"

صدیق علی نے کہا: "گورنر صاحب ایک باخبر آدمی ہیں، بحری سفر کے متعلق ان کے خدشات بلاوجہ نہیں تھے۔ میں نے راستے میں ایک انگریزی جہاز دیکھا تھا آپ کو چکس رہنا چاہیے۔"

ایک نوجوان جو ہم سے نکل کر "بھائی جان، بھائی جان!" کہتا ہوا صدیق علی کی طرف بڑھا اور صدیق علی نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا: "مسعود! تم کب یہاں آئے؟" "بھائی جان! میں تین دن سے یہاں ہوں۔ میں اس قلعے کے آس پاس کی دفاعی چوکیوں کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ہمارے دستے یہاں سے دو میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں، اگر آپ اس وقت فارغ ہوں تو میرے ساتھ پیلیے۔ چچا اسد خاں آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

"وہ یہاں ہیں؟"

"ہاں بھائی جان! اور جب میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ وہ ہمارے کمانڈر ہیں۔"

تو آپ اور زیادہ حیران ہوں گے، پھیلے میں آپ کو ان سے ملانا ہوں۔"

صدیق علی نے کہا: "ابھی جہاز پر دو توہین رہ گئی ہیں۔ میں انہیں اتروانے کے بعد تھارے ساتھ چلوں گا۔"

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب توہین جہاز سے اتار کر ساحل پر پہنچا دی گئیں تو صدیق علی نے قلعہ دار سے مخاطب ہو کر کہا: "اب جہاز پر غلہ لدا کر آپ کی ذمہ داری ہے میں کل صبح ہونے سے پہلے یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔"

قلعہ دار نے کہا: "غلے کے لیے چند دن آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔"

صدیق علی نے کہا: "لیکن منگور کے فوجدار نے مجھے فوراً واپس پھینچنے کا حکم دیا تھا۔ آپ کو ان کی ہدایات موصول نہیں ہوئیں؟"

ان کی ہدایات موصول ہو چکی ہیں لیکن مجھے بڑھوڑ کے صوبہ دار کا حکم ہے کہ ان کی اجازت حاصل کیے بغیر یہاں سے کوئی چیز نہ بھیجی جائے۔ میں نے منگور کے فوجدار کا مراسلہ ان کی خدمت میں بھیج دیا تھا لیکن ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ پھیلے آپ قلعے میں قیام کریں۔ مجھے امید ہے کہ آج یا کل تک ان کی طرف سے جواب آجائے گا۔"

صدیق علی نے جواب دیا: "نہیں میری جگہ جہاز میں ہے۔ میں اب اسد خاں سے ملنے جا رہا ہوں۔ چلو مسعود!"

مسعود علی نے کہا: "بھائی جان! میں پیدل آیا ہوں لیکن اگر آپ چاہیں تو قلعے سے گھوڑوں کا انتظام ہو سکتا ہے۔"

"نہیں! میں پیدل چلنا چاہتا ہوں۔"

صدیق علی اور مسعود سمندر کے کنارے کنارے چند دفاعی چوکیوں کے قریب سے گزرنے کے بعد دائیں ہاتھ مڑے اور کوئی دو میل چلنے کے بعد محفوظ فوج کے پڑاؤ میں

"میں کل علی الصباح یہاں سے واپس جانا چاہتا تھا لیکن اب شاید ایک دو دن ٹھہرنا پڑے گا"

صدیق علی نے باقی دن اسدخان اور اپنے بھائی کے ساتھ پڑاؤ میں گزارا اور سب آفتاب سے کچھ دیر پہلے جب اس نے اسدخان سے اپنے جہاز پر واپس جانے کی اجازت لی تو مسعود اسے ساحل تک پہنچانے کے لیے اس کے ساتھ ہو گیا۔

قلعے کے قریب سے گزرتے ہوئے انھیں افتخار الدین بندرگاہ کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ وہ ہاتھ سے اشارہ کرنے کے بعد تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور اس نے کہا: "میں جہاز پر آپ کو تلاش کرنے گیا تھا۔"

"کیوں خیر تو ہے؟ میرا خیال تھا آپ یہاں سے روانہ ہو چکے ہوں گے۔" میں تو اسی وقت روانہ ہونا چاہتا تھا لیکن اباجان آج سفر کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ اب ہم انشاء اللہ کل علی الصباح روانہ ہو جائیں گے۔ اباجان کی خواہش ہے کہ آپ آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔"

"بہت اچھا! لیکن میں زیادہ دیر آپ کے پاس نہیں ٹھہر سکتا گا۔ رات کے وقت میرا جہاز پر ہونا ضروری ہے۔"

افتخار الدین نے کہا: "ہم آپ کو بہت جلد فارغ کر دیں گے۔ چلیے اباجان کتھے تھے کہ میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر آؤں۔"

صدیق علی نے مسعود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ میرا بھائی مسعود علی ہے۔ افتخار الدین نے مسعود علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "میرا نام افتخار الدین ہے۔ میں نے آپ کو یہاں دو تین بار بندرگاہ پر دکھایا ہے، آئیے آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔" اباجان! آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

داخل ہوئے۔

اسدخان اپنے خیے سے باہر چپل تڑپی کر رہا تھا۔ وہ اچانک صدیق علی کی طرف متوجہ ہوا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا: "ارے تم کہاں؟" جی میں منگلور سے اسلو لے کر آج ہی پہنچا ہوں۔ ابھی مسعود نے بتایا کہ آپ یہاں ہیں اور میں حیران ہوں کہ..."

اسدخان بولا: "کو کیا بات ہے تم خاموش کیوں ہو گئے؟" کچھ نہیں چچا جان!"

اسدخان مسکرایا: "برخوردار! تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس عمر میں ایک سپاہی کا لباس مجھے عجیب معلوم ہوتا ہے۔"

صدیق علی نے کہا: "نہیں چچا جان، میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ مسعود کو جنگ کے میدان سے باہر آپ کی خدمات کی زیادہ ضرورت ہے۔"

اسدخان نے کہا: "مجھے ہنگامی حالات میں صرف خانہ تپری کے لیے بھیجا گیا ہے۔"

صدیق علی نے کہا: "چچا جان! یہ آپ کی کفنی ہے میں جانتا ہوں کہ چند سال قبل میسور کی فوج کے بہترین افسر آپ کی فوجی صلاحیتوں کے معترف تھے۔"

اسدخان بولا: "بیٹا! یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری رگوں میں خون تھا۔ اب خدا سے دعا کرو کہ میں اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کر سکوں۔" "چچا جان! آپ ہر ذمہ داری کے اہل ہیں اور مجھے صرف آپ کی ذات کے لیے دعا کرنی چاہیے۔"

اسدخان نے کہا: "فوج میں رہ کر میری صحت ٹھیک ہو جائے گی۔ تم کب تک یہاں ہو؟"

ناصر الدین نے کہا۔ "یہ قلعہ جہاز کی نسبت بہر حال زیادہ محفوظ ہے اور صوبیدار صاحب کو تو اس بات کا علم بھی نہیں ہوگا کہ ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

"لیکن انھیں آپ کی آمد کی توقع تو تھی نا؟"

"بہر حال رات کے وقت سفر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اگر آپ کو اس قلعے میں ہمارا اصرار ناپسند نہیں تو ہم پڑاؤ میں جانے کے لیے تیار ہیں۔"

"جناب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو میں سارا قلعہ آپ کے لیے خالی کرادوں۔"

صدیق علی نے سوال کیا۔ "صوبیدار صاحب کا ایچی غلے کے متعلق بھی کوئی پیغام لایا ہے؟"

"نہیں غلے کے متعلق انھوں نے کچھ نہیں لکھا لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بہت ممکن ہے کل ان کا حکم آجائے۔ اگر کل نہیں تو پرسوں ضرور آجائے گا۔ کچھ دیر بعد یہ لوگ قلعے کے ایک اور وسیع کمرے میں چند امروں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ دسترخوان پر ناصر الدین کی گفتگو انتہائی شگفتہ تھی لیکن قلعہ دار کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ ناصر الدین نے کوئی لطیفہ سنانے کے بعد قلعہ دار سے سوال کیا۔"

"آپ بہت مخموم نظر آتے ہیں خیر تو ہے؟"

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

کھانا کھانے کے بعد ناصر الدین اور اس کا لڑکا، صدیق علی اور اس کے بھائی کو رخصت کرنے کے لیے قلعے کے دروازے تک آئے۔ مسعود علی کے لیے افتخار الدین کا ایک نوکر گھوڑا لیے کھڑا تھا۔

ناصر الدین نے صدیق علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم علی الصباح روانہ

مسعود علی نے جواب دیا۔ "لیکن مجھے واپس اپنے پڑاؤ میں جانا ہے۔"

افتخار الدین نے کہا۔ "میں آپ کو اپنے نوکر کے ساتھ گھوڑا دے کر بھیج دوں گا۔"

افتخار الدین کے اصرار پر مسعود اس کی دعوت میں شریک ہونے سے انکار نہ کر سکا۔

گھوڑی دیر بعد یہ تینوں قلعے کے ایک کمرے میں ناصر الدین کے ساتھ بیٹھے بات کر رہے تھے۔ رضیہ برابر کے کمرے میں نیم وا دروازے کی آڑ میں کھڑی تھی۔ افتخار الدین اور مسعود علی پہلی ملاقات میں ہی یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہیں۔

ناصر الدین کا ایک نوکر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "قلعہ دار صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ دروازے پر کھڑے ہیں۔"

ناصر الدین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "انھیں اندر لے آؤ۔"

نوکر باہر نکل گیا اور چند تانیہ بعد قلعہ دار کمرے میں داخل ہوا۔ صدیق علی، مسعود علی اور افتخار الدین اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

قلعہ دار نے کہا۔ "بڈ فور سے صوبیدار صاحب کا ایچی ابھی پہنچا ہے۔ انھوں نے تاکید کی ہے کہ اگر آپ پہنچ گئے ہوں تو آپ کو فوراً یہاں سے روانہ کر دیا جائے۔"

ناصر الدین نے کہا۔ "تشریف رکھیے! ہم انشاء اللہ علی الصباح روانہ ہو جائیں گے۔"

"میرا خیال تھا کہ آپ کھانا کھانے کے بعد فوراً روانہ ہو جاتے تو اچھا تھا۔"

ناصر الدین نے جواب دیا۔ "صوبیدار صاحب کو شاید اس بات کا احساس نہیں کہ رات خدانے آرام کے لیے بنائی ہے۔"

قلعہ دار نے کہا۔ "جناب! صوبیدار صاحب یہ محسوس کرتے ہیں کہ ساعلی علاقے ہر وقت خطرے میں ہیں اور یہاں آپ کا تہیام ٹھیک نہیں۔"

کی ضرورت نہیں۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ دشمن کو رات کے وقت ساحل پر اترنے کا موقع نہ دو۔

صدیق علی نے کہا: چچا جان! دشمن اس جگہ فرمیں نہیں آتا رہے گا۔ وہ جانتا ہے کہ قلعے کے آس پاس کا علاقہ اس کیلئے کہیں زیادہ محفوظ ہے۔

اسدخان نے کہا: تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی!

صدیق علی نے جواب دیا: جب دشمن کے جہاز ہمارے جہاز پر گولہ باری کر رہے تھے تو قلعے کی توپیں خاموش تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ قلعے کے محافظ بچوں سے متعلیٰ دکھا کر یہ بتا رہے تھے کہ ہم یہاں ہیں۔ اس لیے تمہاری توپوں کا رخ دوسری طرف ہونا چاہیے۔

اسدخان نے اچانک اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن درد سے کراہتا ہوا دوبارہ لیٹ گیا اور درد سے توقف کے بعد بولا: صدیق علی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ تمہارا مشورہ کیلئے ہے؟

صدیق علی نے کہا: مجھے یقین ہے کہ ان مورچوں پر دشمن کی گولہ باری محض ایک دکھاوا ہے۔ وہ صبح کے وقت اطمینان سے قلعے کے آس پاس فرمیں آتا دے گا۔ اگر آپ کڑا پور کو بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں صبح سے پہلے قلعے پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ آپ پڑاؤ میں سوار دستوں کو یہ حکم بھیج دیجیے کہ اس طرف ابھی ان کی ضرورت نہیں۔ وہ دشمن کے جنگی بیڑے کی توپوں کی زد سے دور رہیں۔ پھر اگر دشمن نے کسی جگہ فوج اتار دی تو انہیں کام میں لایا جاسکے گا۔

اسدخان نے کہا: صدیق میرا وقت آپ کا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ قدرت نے تمہیں بلاوجہ نہیں بھیجا۔ جب تک میں میری جگہ لینے کے لیے کوئی اور نہیں آجاتا میں اس فوج کی کمان تمہیں سونپتا ہوں۔

ہیں؟" جواب میں اسے برعکس سپاہیوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ کماندار ابھی یہاں تھے۔ "کماندار صاحب گھوڑے پر آگے نکل گئے ہیں۔"

صدیق علی نے پانچویں چوکی کے قریب پہنچ کر اپنا سوال دہرایا۔ تو تاریکی میں اسے مسعود علی کی آواز سنائی دی۔ "بھائی جان! بھائی جان! کماندار صاحب اگلے مورچے میں ہیں وہ زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑے تھے۔"

"مسعود! مسعود!!" صدیق علی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا: "مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

وہ بھاگتے ہوئے اگلے مورچے میں داخل ہوئے۔ اسدخان زمین پر لیٹا ہوا تھا اور چند افسر اور سپاہی اس کے گرد جمع تھے۔

"چچا جان! صدیق علی نے اس کے قریب بیٹھ کر بھڑائی ہوئی آوازیں کہا: اسدخان نے نجی آواز میں کہا: "کون! — صدیق علی — تم یہاں!! لیکن تمہارا جہاز؟"

"میرا جہاز ڈوب چکا ہے۔ آپ کے زخم زیادہ شدید تو نہیں؟" میرے زخموں کی پروا نہ کر۔ میری منزل آپ کی ہے۔" صدیق علی نے کہا: "چچا جان! ان حالات میں فوج کو آگے لانے کی بجائے پیچھے ہٹانے کی ضرورت تھی۔"

اسدخان نے جواب دیا: "ان چوکیوں کی حفاظت میرا فرض تھا۔" صدیق علی نے کہا: "ان چوکیوں کے سپاہی دور مار توپوں کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے اور وہ آپ کے پاس نہیں ہیں۔"

اسدخان نے کہا: "ہمارے پاس چار بڑی توپیں تھیں اور وہ میں نے قلعہ دار کے اصرار پر یہاں پہنچے ہی قلعہ کے اندر بھجوا دی تھیں۔ تم لوگوں کو میرے گرد جمع ہونے

”چچا جان! مجھے یقین ہے کہ آپ اچھے ہو جائیں گے۔“ یہ کہہ کر صدیق علی پر ہونٹوں کی طرف متوجہ ہوا۔ انھیں پڑاؤ کے پیچھے کسی محفوظ جگہ لے جاؤ۔ یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔“

اسدخان نے نسیخت آواز میں کہا: ”بیٹا تم وقت ضائع نہ کرو۔ اب میرے لیے کوئی جگہ محفوظ نہیں۔“

سپاہی امدغیاں کو تختے پر ڈال کر اٹھانے لگے تو کسی نے کہا: ”جلدی سے پانی لادو یہ بے ہوش ہیں۔“

فوجی طبیب نے جلدی سے نبض ٹٹولی اور پھر ٹھیک کر تھوڑی دیر اس کے بیٹے سے کان لگانے کے بعد کہا: ”اب انھیں پانی پلانے کی ضرورت نہیں۔“

صدیق علی نے ڈیڑھ سو سپاہیوں کو ساحلی چوکوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر محفوظ فوج کے ایک ہزار سپاہیوں کو قلعے کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ صبح کی روشنی کے ساتھ دشمن کے جنگی بیڑے کی گولہ باری بند ہو چکی تھی۔ صدیق علی کی رہنمائی میں یہ فوج قلعے کے قریب پہنچی تو برج پر سفید جھنڈا دکھائی دیا۔ صدیق علی نے دروازے کے قریب پہنچ کر بند آواز میں کہا: ”دروازہ کھولو!“

کچھ دیر کوئی جواب نہ ملا۔ پھر بڑے چھاگ کی بجائے بغلی دروازہ کھلا اور صدیق علی کی توقع کے خلاف قلعہ دار نے باہر نکل کر کہا: ”تمہارے کمانڈر کہاں ہیں؟“

صدیق علی نے اگے بڑھ کر کہا: ”اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے یہ صلح کا جھنڈا کس کے حکم سے بند کیا ہے؟“

قلعہ دار نے جواب دیا: ”آپ مجھ سے اس قسم کے سوالات پوچھنے کا حق نہیں رکھتے تاہم آپ کی تسلی کے لیے یہ بات کافی ہونی چاہیے کہ میں نے اپنے سے بڑوں

کی ہدایات پر عمل کیا ہے۔“

”اور حملے کے وقت آپ نے قلعے کے برجوں پر جو روشنی کی تھی وہ بھی غائبانگی بڑے کی ہدایت کے مطابق تھی؟“

”ہاں!“

”میں جانتا چاہتا ہوں کہ وہ بڑا کون ہے؟“

”اس وقت اس سوال کا جواب میں صرف فوج کے کمانڈر کو دے سکتا ہوں۔“

تمہارا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔“

صدیق علی نے کہا: ”اس وقت میں اس فوج کا کمانڈر ہوں۔“

”اگر آپ اس فوج کے کمانڈر ہیں تو آپ کے لیے بڑوں کے گورنر کا یہ حکم ہے

کہ آپ فوج کو یہاں سے نکال کر حیدر گڑھ پہنچ جائیں۔ وہاں آپ کو مزید ہدایات ملی جائیں گی۔“

”میں بڑوں کے گورنر سے تصدیق کے بغیر کوئی نیا قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں

ہوں۔ اس فوج کو کھنڈاپور کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور کھنڈاپور کی حفاظت

آج اس وقت تک کریں گے جب تک کہ دشمن اس قلعے کی دیواریں زمین سے ہموار نہیں کر دیتا۔“

قلعہ دار کا چہرہ غصے سے تھما اٹھا اور اس نے کہا: ”اس قلعے کے ساتھ تمہارا

کوئی تعلق نہیں۔ اس کی حفاظت کے متعلق سوچنا ہمارا کام ہے۔“

”اور تم نے اس کی حفاظت کا جو نیا طریقہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب رات

ہو تو قلعے کے برجوں پر روشنی کر دی جائے اور جب صبح ہو جائے تو سفید جھنڈا لہرا

دیا جائے؟“

”میں نے جو کچھ کیا ہے میں اس کی پوری ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

ہمیں حکم تھا کہ خطرے کے وقت یہ قلعہ خالی کر دیا جائے؟  
اور تمہیں یہ بھی حکم تھا کہ خطرے کے وقت دشمن کو یہ بتا دیا جائے کہ تمہارا  
مقابلہ کرنے والی فوج باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔

میرا فرض اپنے سپاہیوں کو بلاوجہ ہلاک ہونے سے بچانا تھا لیکن تم جیسے گستاخ  
آدمی سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تمہارے نزدیک ان سپاہیوں کی زندگی  
کوئی معنی نہیں رکھتی تو تمہیں اس بات کی آزادی ہے کہ تم سینہ تان کر دشمن کی توپوں  
کے سامنے کھڑے ہو جاؤ لیکن مجھے حیدر گڑھ پہنچنے کی ہدایات موصول ہو چکی ہیں۔  
یہ کہہ کر قلعہ دار دروازے کی طرف پلٹا لیکن صدیق علی نے اچانک آگے بڑھ  
کر اس کا راستہ روک لیا اور میان سے تلوار نکال کر اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔  
”تم قلعے کے اندر نہیں جا سکتے۔“

ایک ثانیہ کے اندر اندر پہرے داروں نے قلعے کا بغلی دروازہ اندر سے  
بند کر لیا۔

قلعہ دار نے کہا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ تمہارے سپاہی اس وقت ہماری  
گولیوں کی زد میں ہیں۔ اگر تم فیصل کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی تکلیف کرو تو تمہاری  
بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

صدیق علی نے کہا۔ تم یہ دیکھنے کے لیے موجود نہیں ہو گے کہ ہماری غلط فہمیاں  
کس حد تک دور ہوئی ہیں۔ اگر ایک منٹ کے اندر اندر قلعے کا دروازہ نہ کھلا تو میری  
تلوار تمہارے سینے سے پار ہوگی۔

قلعہ دار نے صدیق علی کے الفاظ سے زیادہ اس کی تلوار کی نوک کا دباؤ لپٹنے  
سینے پر محسوس کیا اور اس نے کسی توقف کے بغیر بلند آواز میں کہا۔ ”دروازہ  
کھول دو!“

دروازہ کھل گیا اور صدیق علی اپنے ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ قلعے کے اندر  
داخل ہو گیا۔ قلعے کے سپاہی پریشانی اور تذبذب کے عالم میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے  
صدیق علی نے بلند آواز میں کہا۔ ”میں ملک کی فوج میں غدار موجود ہوں اس کے  
آہنی قلعے بھی محفوظ نہیں ہوتے۔ میرے دوستو! اس قلعے کا محافظ دشمن کے  
ساتھ مل گیا ہے۔ میسور کی فوج تمہاری اور تمہاری آنے والی نسلوں کی عزت اور  
آزادی کی جنگ لڑ رہی ہے۔ میسور کی فتح اس ملک کے ہر اس باعزت انسان کی  
فتح ہوگی جو ایک باعزت قوم کے فرد کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا ہے اور۔ اگر  
خدا نخواستہ میسور کو شکست ہوئی تو اس کے نتائج صرف میسور کی سرحدوں تک  
محدود نہیں رہیں گے۔ بلکہ ہندوستان کا ہر تہیت پسند یہ محسوس کرے گا کہ اس  
کے لیے عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ تمہارے  
قلعہ دار کو دشمن کے حملے کا قبل از وقت علم تھا اور اس نے دشمن کے استقبال کے  
لیے قلعے پر چاغاں کیا تھا۔ اس کی بزدلی اور غداری کے باعث ہمارے کئی آدمی شہید  
ہو چکے ہیں۔ کاش میں ہر غدار کو قلعے کے دروازے پر چالیس بار بھانسی دے سکتا۔  
میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ تم میں سے اور کون ہیں جو اس سازش میں شریک ہیں؟“  
قلعے کے سپاہیوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

صدیق علی نے تدریے سے توقف کے بعد کہا۔ ”میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم دشمن  
کے خلاف جنگ میں ہمارا ساتھ دینا چاہتے ہو یا بزدلوں اور غداروں کی موت مرنا  
چاہتے ہو؟“

ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ ”ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“  
چند اور آدمیوں نے اس کی تقلید کی اور وہ ایک ایک کر کے صدیق علی کے گرد  
جمع ہونے لگے۔

صدیق علی نے کہا: اس قلعے میں اسلوحہ کی نہیں، بارود کا ذخیرہ جو میں لایا تھا، اتنا ہے کہ ہم کم از کم ایک ہفتہ دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس عرصہ میں یقیناً ہمیں ملک پہنچ جائے گی۔

ایک نوجوان افسر نے آگے بڑھ کر کہا: "ہم آپ کے ساتھ جان دینے کے لیے تیار ہیں لیکن ہمارے پاس جو بارود ہے وہ ایک دن کے لیے بھی کافی نہیں۔ آپ جو بارود اپنے ہمالہ پر لائے تھے وہ رات کے حملے سے پہلے ہی سمندر میں پھینک دیا گیا تھا۔ قلعہ دار دشمن کے ساتھ سازباز کرنے کے بعد ہماری طرف سے مطمئن رہتا، اسے یہ خبر نہ تھا کہ ہم کہیں اس کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں۔"

اس کا مطلب ہے کہ یہ شخص کنڈاپور کی قسمت کا فیصلہ دشمن کی آند سے پہلے ہی کر چکا تھا۔ اسے لے جاؤ اور قلعہ سے باہر کسی درخت کے ساتھ لٹکا دو۔"

صدیق علی کے اشارے سے چند سپاہیوں نے اپنی سنگین قلعہ دار کی طرف سیٹھی کر دیں اور اسے باہر نکلنے کے لیے کہا۔

قلعہ دار چلایا: "بڈوڑ کا گورنر میرے بدلے تم میں سے ہر ایک کو پھانسی پر لٹکا دے گا۔ میں نے اس کے احکام کی تعمیل کی ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ میرا معاملہ اس کے سپرد کر دیا جائے۔ خدا کے لیے کسی آدمی کو بھیج کر میرے متعلق ان سے پوچھ لو۔ ورنہ مجھے بڈوڑ بھیج دو۔"

صدیق علی نے کہا: "اگر تم بڈوڑ کے صوبیدار کے بھائی ہوتے تو بھی اس غدار کے بعد میں تمہارے متعلق کسی تحقیقات کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ اگر تم سلطان معظم کے بھائی ہوتے تو بھی تمہارے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا۔"

ناہر الدین، افتخار الدین اور رضیہ اپنے اپنے کمرے سے نکل کر انتہائی پریشانی کی حالت میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ افتخار الدین سپاہیوں کو راستے سے ہٹاتا

ہوا آگے بڑھا اور اس نے کہہ دیا: "یہ شخص جھوٹ بولتا ہے اس نے اس شخص کے خلاف غلط بیانی کی ہے جسے حیدر علی اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔ اس کے لیے کوئی سزا کافی نہیں ہو سکتی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس کی سازش میں جو افسر یا سپاہی شریک ہیں۔ ان سب کو پھانسی دے دی جائے۔"

صدیق علی نے کہا: "انتہار میں اس معاملے کی پوری چھان بین کروں گا لیکن اس وقت ہمارے سامنے ڈری سڈ اس قلعے کی حفاظت ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں تم دوبارہ جنگ شروع ہونے سے پہلے اپنے والد اور ہمیشہ کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ۔"

افتخار الدین نے جواب دیا: "میں ایک سپاہی ہوں اور میرے ابا اور ہمیشہ بھی یہ پسند نہیں کریں گے کہ میں میدان چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ میرے ساتھ جو جس آدمی آئے تھے وہ انہیں بڈوڑ پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔"

صدیق علی نے آگے بڑھ کر ناصر الدین سے کہا: "میں چاہتا ہوں کہ آپ وقت ضائع نہ کریں۔ آپ بڈوڑ بھیج کر گورنر کو میرا پیغام دیجیے کہ کنڈاپور کی فوج آخری دم تک دشمن کا مقابلہ کرے گی۔"

ناصر الدین نے کہا: "میں دہاں پہنچنے ہی آپ کو ملک بھرانے کی کوشش کروں گا۔"

تھوڑی دیر بعد قلعے کے دروازے سے باہر افتخار الدین اپنے باپ اور اپنی اپنی بہن کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ سامنے ایک درخت پر قلعہ دار کی لاش لٹک رہی تھی۔

رضیہ نے گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد اپنی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے "بھائی جان! اپنا خیال رکھنا!"

فصیل سے ایک سپاہی نے بلند آواز میں کہا: "سائے درجہ ہند کشتیوں پر فوج اتار رہے ہیں اور شمال مغرب سے چار اور جہاز اس طرف آ رہے ہیں۔"  
صدیق علی نے کہا: "سپاہیو! اپنے موپے سنبھال لو۔ سفید جھنڈا تارو اور قلعے کا دروازہ بند کر لو۔"

افتخار الدین نے کہا: "انگریز لڑائی سے زیادہ چال اور دغا بازی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہمیں سفید جھنڈا اس وقت اتارنا چاہیے جب ان کی کشتیاں ہماری توپوں کی زد میں آجائیں۔"

صدیق علی نے جواب دیا: "جنگ اور صلح کے متعلق ہمارے اصول ان سے مختلف ہیں۔ میں سلطان ٹیپو کا سپاہی ہوں اور سلطان کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ ہم دھوکے اور فریب میں دشمن کی پیروی کریں۔ میں قلعہ دار کو اس کے جرم کی سزا دے چکا ہوں، دشمن سے اس کی غداری کا انتقام نہیں لے سکتا۔"

صدیق علی فصیل پر چڑھا۔ دشمن کے جہازوں سے چھ کشتیاں کنارے کی طرف آ رہی تھیں۔ ایک کشتی پر سفید جھنڈا لہا رہا تھا۔ صدیق علی نے دشمن کو خبردار کرنے کے لیے توپ چلانے کا حکم دیا۔ توپ کی آواز سن کر کشتیاں واپس چلی گئیں اور دشمن کے جہازوں پر "اے اے" کی شہزادہ کر دی۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد دشمن کے دو جہاز بھی بندرگاہ کے سامنے پہنچ گئے جنہوں نے رات کے وقت شمال کی ساحلی چوکیوں پر گولہ باری کی تھی۔ قلعے میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ساٹھ اور زخمیوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچ چکی تھی۔ صدیق علی دور میں لیے ایک جڑ پر کھڑا توپچیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ افتخار الدین جھانکتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا: "دیکھیے ایک جہاز ساحل کے قریب آ رہا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے! صدیق علی نے جواب دیا: "لیکن ادھر دیکھو وہ دو جہاز

اب پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ بری طرح شکستہ ہو چکا ہے۔

افتخار الدین نے کہا: "مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میری حیثیت ابھی تک ایک تماشائی سے زیادہ نہیں۔ کاش میری بندوقوں کی گولیاں دشمن تک پہنچ سکتیں۔"

صدیق علی نے جواب دیا: "تمہارے امتحان کا وقت آ رہا ہے، اس لڑائی کا آخری فیصلہ تمہاروں اور بندوقوں سے ہی ہوگا۔"

صدیق دور میں لگا کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک اسے اپنے دائیں ہاتھ ایک ہلکی سی چیخ اور اس کے ساتھ ہی کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، افتخار منہ کے بل پڑا تھا۔ صدیق علی نے اسے اٹھانے کی کوشش کی اور اس کے ہاتھ خون سے تر ہو گئے۔

"افتخار! افتخار!" اس نے اسے پٹیٹھے کے بل لٹاتے ہوئے کہا لیکن افتخار کسی اور دنیا میں پہنچ چکا تھا۔

"اسے پیچھے لے جاؤ!" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں سپاہیوں سے کہا۔  
صدیق علی چند تینے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر دور میں لگا کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور فضا بیک وقت قلعے کی کسی توپوں کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔



ناصر الدین نے کہا۔ ”مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ نے کنڈاپور خالی کرنے کا حکم بھیجا ہے تو صدیق علی آپ کے ایلچی پر اعتماد نہیں کرے گا۔ اسے اس بات کا یقین نہیں آئے گا کہ آپ ایسی غلطی کر سکتے ہیں۔“

ایاز خاں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”میں اب یہ سوچ رہا ہوں کہ اس بیوقوف کو پھانسی دینے کے لیے کون سی جگہ موزوں رہے گی۔“

ناصر الدین نے کہا۔ ”اس نے ایک محب وطن سپاہی کا فرض ادا کیا ہے اور وہ سزا کی بجائے انعام کا مستحق ہے۔ قلعہ دار کی غزاری کے بعد اس کا وہاں پہنچنا آسان ہی تھا۔ ایاز خاں نے کہا۔ ”آپ تشریف رکھیے! میں آپ سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

ناصر الدین ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ایاز خاں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے دروازے کے وقت کے بعد کہا۔ ”میں یہاں پہنچتے ہی آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہیے۔ کنڈاپور کے قلعہ دار نے میرے ساتھ غزاری نہیں کی تھی۔“

ناصر الدین چند ثانیے سکے کے عالم میں ایاز کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ ”آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس نے آپ کے حکم کی تعمیل کی تھی؟“

”ہاں۔“

”اور آپ کا حکم یہ تھا کہ کنڈاپور کا قلعہ کسی مزاحمت کے بغیر دشمن کے حوالے کر دیا جائے؟“

”جی ہاں۔“

ناصر الدین اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن ایاز خاں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دروازہ کھری پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی، زندگی میں ہمیں بسا اوقات

## بیسواں باب

بٹور کا گورنر ایاز خاں اپنے محل کے ایک کمرے میں ٹھہل رہا تھا اس کی آنکھوں سے ایک بھیڑیے کی سفاکی اور اس کے چہرے سے ایک لومڑی کی عیاری مترشح تھی۔ ناصر الدین کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ ”میں ساری رات نہیں سو سکا کہیے کنڈاپور سے کوئی خبر آئی؟“

”نہیں! میں حیران ہوں کہ میرے ایلچی نے اتنی دیر کیوں لگائی!“

”میرے خیال میں آپ کی کمک پہنچ گئی ہوگی۔“

ایاز خاں نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے کہ کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے قلعے کے

محافظ کو یہ حکم بھیج دیا تھا کہ وہ فوج وہاں سے نکال کر حیدر گڑھ پہنچ جائے۔“

”لیکن مجھے تو آپ نے بتایا تھا کہ آپ کمک بھیج رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن اب میں قلعے کی حفاظت بے سود سمجھتا ہوں۔ مجھے اندیشہ

ہے کہ قلعے کے نئے محافظ کی حماقت کی وجہ سے بہت سی جانیں ضائع ہو جائیں

گی اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ آپ افتخار الدین کو ایسے آدمیوں کے

پاس چھوڑ آئے ہیں۔ بہر حال آپ کو فکر مند نہیں ہونا چاہیے، مجھے یقین ہے کہ قلعے کی

فوج اب حیدر گڑھ پہنچ چکی ہوگی اور میں نے افتخار الدین کے لیے یہ حکم بھیج دیا

ہے کہ وہ فوراً یہاں آجائے۔“

ایسی حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ناقابل یقین معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم جنگ ہار چکے ہیں۔

آپ مذاق کر رہے ہیں! ناصر الدین نے اپنی بدحواسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا۔ میسور ساری دنیا کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔ وہ چند جہاز جو آپ نے کنڈاپور کی بندرگاہ میں دیکھے تھے، ایک زبردست جنگی بیڑے کے برابر تھے۔ انگریزوں کی فریج چند دن تک یہاں پہنچ جائے گی۔ ملیا کر کے تمام ساحلی علاقوں پر ان کا قابض ہو جانا یقینی ہے۔ سلطان میسور کو اور مشرق کے تمام علاقے خطرے میں ڈالے بغیر اس طرف نہیں آسکتا۔ اب میں میسور کی بجائے اپنے مستقبل کے متعلق سوچنا چاہیے!“

ناصر الدین نے کہا۔ ”میں اپنا مستقبل میسور کے ساتھ وابستہ کر چکا ہوں۔“

”نہیں! آپ کا مستقبل بڈنور کے صوبیدار کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے۔“

”لیکن ان حالات میں جب کہ انگریزی فوجیں.....!“

ایاز خاں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ انگریز مجھ سے بڈنور کی صوبیداری نہیں چھینیں گے۔“

”ان حالات میں میرے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ انخار الدین کے یہاں پہنچتے ہی واپس منگور چلا جاؤں گا۔“

”آپ رضیہ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں؟“

ایک تازی کے لیے ناصر الدین کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ بالاخر اس نے کہا۔

”رضیہ میرے ساتھ جائے گی۔“

”نہیں! رضیہ یہیں رہے گی اور آپ بھی یہیں رہیں گے۔ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ اب آپ منگور واپس جانے کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہ لائیں۔“

منگور آپ کے دہاں پہنچنے سے پہلے انگریزوں کے قبضہ میں جا چکا ہوگا۔“

”ہم کسی اور جگہ چلے جائیں گے۔“

اگر آپ یہ ثابت کر سکیں کہ آپ کی صاحبزادی کے لیے اس ملک میں بڈنور سے بہتر کوئی اور جگہ ہو سکتی ہے تو میں اسے بکوشی دہاں بھیج دوں لیکن وہ اس عمل میں رہنے کے لیے پیدا ہوئی ہے، اگر آپ کو میرے متعلق کوئی شبہ ہے تو میں آج اسے اپنی زینتی حیات بنانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں کہ آپ لوگ اس عمل سے باہر ایک معمولی سے مکان میں رہیں۔“

باہر پیہہ داروں کا شور سنانا دیا۔ کوئی بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”میں اسی وقت صوبیدار سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم میرا راستہ نہیں روک سکتے۔ بیوقوفو! میں کنڈاپور سے آیا ہوں!“

ایاز خاں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا، اس کے دائیں بائیں اور پیچھے چار پہرے دار ننگی تلواریں بلند کیے ہوئے تھے۔ ایاز نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ پیچھے ہٹ گئے۔ نوجوان چند قدم آگے بڑھا اور ایاز خاں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ناصر الدین نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا یہ مسعود علی تھا۔

ایاز نے پوچھا۔ ”تم کنڈاپور سے آئے ہو؟“

”جی ہاں! وہاں حالات بہت جلدوش ہیں۔ ہمارا بارود ختم ہو چکا ہے۔ دشمن کے جنگی بیڑے کے پانچ اور جہاز دہاں پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے تین بار قلعے کے آس پاس مختلف مقامات پر فوجیں اتارنے کی کوشش کی۔ بے لیکن ہم نے انہیں ہر بار سمندر میں دھکیل دیا ہے۔ قلعے کے محافظ اس وقت بلے کے ڈھیروں پر پورے بنا کر لڑ رہے ہیں۔ ہمارے نصف سے زیادہ سپاہی زخمی اور ہلاک ہو چکے ہیں۔ ہمیں بہت جلد پیچھے ہٹ کر ساحل پر اترنے والی فوج کے ساتھ فیصلہ کن جنگ لڑنا پڑے۔“

گی۔ ہم ملک کا انتظار کر رہے تھے لیکن کل چند فٹار آپ کے ایجنوں کا بھیس بدل کر وہاں پہنچے اور انہوں نے ہمیں آپ کا یہ حکم دیا کہ ہم میدان چھوڑ دیں اور تین حصوں میں تقسیم ہو کر حیدر گڑھ۔ امنت پور اور ادنور پہنچ جائیں۔ یہ حکم نہایت عجیب تھا۔ کمانڈر نے ان آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے اور مجھے آپ کے پاس تصدیق کے لیے بھیجا ہے۔

ایاز خاں کا چہرہ مجھ سے سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "اب اگر تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ تمہیں بھی غدار نہیں سمجھے گا تو تم فرار واپس جا کر اسے میرا یہ حکم دو کہ وہ کنڈا پور خالی کر دے اور سیدھا میرے پاس آئے۔ تم وقت ضائع نہ کرو۔ تمہارے ساتھ اور کتنے آدمی ہیں؟"

مسعود علی نے جواب دیا۔ "میرے ساتھ صرف دو آدمی ہیں۔"

ایاز خاں نے پہرے داروں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم ان کے ساتھ جاؤ اور اسطبل کے داروغہ سے کہو انہیں تازہ دم گھوڑے دے دے۔"

پہریدار کمرے سے باہر نکل گئے لیکن مسعود علی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ اس کی نگاہیں اصرار پر مرکوز تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "میں نے یہاں پہنچنے ہی آپ کو تلاش کیا تھا آپ گھر پر نہیں تھے۔ مجھے انوس بے کہ میں آپ کے لیے اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔۔۔۔۔ انتظار الدین شہید ہو چکا ہے۔"

"مجھے معلوم تھا۔ ناصر الدین نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

ایاز خاں آسمانی پریشانی کی حالت میں کبھی ناصر الدین کی طرف اور کبھی مسعود علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ناصر الدین اٹھا اور کچھ کے بغیر دروازے کی طرف بڑھا ایاز خاں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "چلیے میں آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں۔"

ناصر الدین نے کہا۔ "میں! خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔ مجھے چند گھنٹے تنہائی کی ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر ناصر الدین باہر نکل گیا۔ مسعود علی اس کے پیچھے جانے لگا لیکن ایاز خاں نے کہا۔ "نوجوان ٹھہرو! میرا خیال ہے کہ تم نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا ہے۔"

ناشتا مجھے راستے میں مل جائے گا۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو میں فوراً واپس جا رہا چاہتا ہوں۔"

"تم ناصر الدین کے گھر میں یہ خبر دے آئے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اب واپسی پر بھی وہاں جاؤ گے؟"

"جی نہیں! اگر وہ یہاں نہ ملے تو جی میرے پاس انہیں تلاش کرنے کے لیے وقت نہ تھا۔"

مجھے ان کے بیٹے کی موت کا بڑا انوس ہے۔ اچھا تم جاؤ اور کنڈا پور کے محانظا سے کہو کہ میں اس سے خفا بھی ہوں اور خوش بھی۔۔۔ خفا اس بات پر کہ اس نے میرے ایجنوں کو قید کر دیا ہے اور خوش اس بات پر کہ اس نے فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے لیکن اب اسے قلعہ خالی کرنے کے متعلق میرے احکام کی تعمیل کرنی چاہیے۔"



تھوڑی دیر بعد مسعود علی اور اس کے ساتھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے شہر سے باہر نکل رہے تھے تو انہیں سامنے ایک سوار دکھائی دیا۔ جب وہ قریب پہنچے تو اس نے ہاتھ بند کرنے ہوئے چلا کر کہا۔ "مسعود علی صاحب ٹھہریے!"

مسعود علی نے گھوڑا روکا اور سوار نے کہا۔ "میں ناصر الدین کا نوکر ہوں۔ وہ آپ کے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ آپ تھوڑی دور آگے چل کر ان کا انتظار کریں۔"

"وہ یہاں آئیں گے؟"

"ہاں! چلیے ذرا آگے نکل چلیں۔"

کوئی آدھ میل چلنے کے بعد ناصر الدین کے نوکر نے کہا: "بس اب یہیں ٹھہر جائیے۔ وہ تھوڑی دیر تک پہنچ جائیں گے۔"

مسعود علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں سے اتر کر زمین پر بیٹھ گئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد مسعود علی نے کہا: "ہمیں بہت دیر ہو رہی ہے۔ ہم اس سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔"

نوکر نے کہا: "جناب! انہوں نے یہ کہا تھا کہ آپ کو روکنا بہت ضروری ہے اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر میں آپ کو نہ روک سکا تو بڈا اور ملیا رکی تباہی یقینی ہے۔" مسعود علی کے ایک ساتھی نے شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "شاید کوئی آ رہا ہے۔"

مسعود علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک سوار پوری رفتار سے آ رہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو مسعود علی نے کہا: "یہ ناصر الدین تو نہیں معلوم ہوتے۔ ارے یہ تو کوئی عورت ہے۔" نوکر نے کہا: "یہ ناصر الدین کی صاحبزادی ہیں۔"

مسعود علی اور اس کے ساتھی پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ رضیہ نے گھبراہٹ کا اور کسی تہمید کے لہر کہا: "چلیے!"

"کہاں؟" مسعود علی نے سوال کیا۔  
"کنڈاپور۔"

"آپ ہمارے ساتھ جائیں گی؟"  
"ہاں! وقت ضائع نہ کیجیے!"  
"لیکن کنڈاپور میں اب عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"  
"آپ کا بھائی وہاں ہے؟"  
"ہاں۔"

"اباجان! نے مجھے ایک ضروری پیغام دے کر ان کے پاس بھیجا ہے۔ خدا کے لیے اب وقت ضائع نہ کیجیے!"

مسعود علی کچھ کے بغیر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی

تھوڑی دیر بعد ان کے گھوڑے ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے۔ مسعود علی اور اس کے ساتھی اپنے رسلے کے بہترین سوار تھے لیکن ان کے نزدیک رضیہ کی ہمت قابلِ اتقائی تھی۔ مسعود علی کے ذہن میں کئی سوال تھے جو وہ رضیہ سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن جب وہ حزن و ملال کی اس تصویر کو دیکھتا تو اسے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ راستے کی پہلی چوکی پر وہ گھوڑے بدلنے کے لیے رُکے۔ مسعود علی اور اس کے ساتھیوں کا بھوک سے بُرا حال ہورہا تھا۔ مسعود علی نے چوکی کے محافظ کو کھانا لانے کے لیے کہا اور پھر رضیہ کی طرف دیکھ کر بولا: "میرے خیال میں آپ بھی کچھ کھالیں۔"

مجھے بھوک نہیں! آپ جلدی کریں!"  
شام کے وقت وہ کنڈاپور سے تھوڑی دور ایک چوکی میں پہنچ گئے۔ مسعود علی نے رضیہ کو ایک کمرے میں پہنچا کر کہا: "آپ کو آرام کی ضرورت ہے، آپ کھانا کھا کر سو جائیں میں آپ کا نوکر اور اپنا ایک ساتھی آپ کے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ہماری منزل اب زیادہ دور نہیں ہے۔ میں دو گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ خدا معلوم وہاں حالات کیسے ہیں۔ اس لیے آپ کے پاس آدھی بیچ دوں گا۔ اگر آپ کے پاس کوئی ضروری اطلاع ہے تو مجھے بتا دیجیے۔"

رضیہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا: "میں آپ کے ساتھ جاؤں گی، مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔ مسعود علی نے کہا: "میں انصار الدین کی بہن کو ناراض نہیں کر سکتا لیکن کاش مجھے اس بات کا یقین ہوتا کہ کنڈاپور آپ کے لیے محفوظ ہے۔ آپ کے لیے اپنے بھائی کی کوتاہی"

کو یقین تھا کہ آپ کے بھائی جان مجھے کسی محفوظ جگہ پہنچادیں گے۔ جب اباجان ایاز کے ساتھ میری منگنی کر رہے تھے تو وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ایک بڑا آدمی ہے اور میں بھی یہ سوچتی تھی کہ میں خوش قسمت ہوں۔ خدا کے لیے مجھے کسی ایسی جگہ پہنچا دیجیے جو اس قوم فزوش کی دسترس سے باہر ہو۔

مسعود علی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: "آپ اطمینان رکھیں۔ اب آپ کو کوئی خطرہ نہیں لیکن میں آپ کے والد کے متعلق پریشان ہوں۔ وہ آپ کے ساتھ نہیں رہا؟ انہیں یہ ڈر تھا کہ ایاز بہت جلد ہمارے گھر آئے گا۔ وہ اسے غلطی میں مبتلا رکھنے کے لیے وہاں ٹھہرا مزدوری سمجھتے تھے۔ اگر انہیں موقع ملا تو وہ آج رات وہاں سے روانہ ہو کر خشکی کے راستے سیدھے منگلوکارخ کریں گے اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر منگلوکار کو کوئی خطرہ درپیش ہوا تو وہ سرنگا پٹم چلے جائیں گے۔"

مسعود علی نے کہا: "میں گھوڑے دیکھتا ہوں۔ اب شاید ہمارا سفر بہت طویل ہو جائے۔ آپ چند دنوں کے سفر رکھا لیجیے!"

"مجھے بالکل بھوک نہیں۔ آپ جلدی تیاری کریں۔"



چند منٹ بعد مسعود علی، رضیہ اور ان کے ساتھی رات کی تاریکی میں گھوڑوں پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہوئے اور قریباً چار میل سفر کرنے کے بعد جب وہ ایک ندی کے پل کے قریب پہنچے تو کسی نے بلند آواز میں کہا: "ٹھہرو، کون ہے؟"

مسعود علی نے گھوڑا روک کر جواب دیا: "میں مسعود علی ہوں۔"

چار مسلح سپاہی آگے بڑھے اور ان میں سے ایک نے کہا: "آپ کماندار صدیق علی خاں کے بھائی ہیں؟"

ان — اور تم کون پور کی فوج کے آدمی ہو؟"

یقیناً ایک بہت بڑا سا نجر ہے لیکن وہاں جا کر آپ کا غم غلط نہیں ہو سکتا۔ آپ کے اباجان اگر وہاں کوئی ضروری پیغام پہنچانا چاہتے تھے تو اس کے لیے آپ کا بھیجا بھی ضروری نہ تھا۔ وہ مجھ پر اعتماد کر سکتے تھے۔"

رضیہ نے مضطرب ہو کر کہا: "آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں آپ کو صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ میرا فردا کنڈاپور پہنچنا ضروری ہے۔"

مسعود علی نے قدرے توقف کے بعد کہا: "اگر آپ کسی خطرے سے بھاگ رہی ہوں تو بھی آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے۔ میں صدیق علی کا بھائی ہوں۔"

رضیہ نے مسعود علی کی طرف دیکھا اور اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڑ آئے۔ چند منٹ اپنے ضبط کرنے کی ناکام کوشش کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

ایک سپاہی کھانے کا طشت اٹھائے کرے میں داخل ہوا۔ مسعود علی نے اس کے ہاتھ سے طشت لے کر رضیہ کے سامنے رکھ دیا۔ سپاہی واپس چلا گیا۔ مسعود علی نے رضیہ کی طرف توجہ ہو کر کہا: "اگر آپ کو میری کسی بات سے دکھ پہنچا ہے تو میں معافی کا خواہگار ہوں۔"

رضیہ نے اپنے آنسو پونچھے ہوئے کہا: "اگر آپ پر مجھے اعتماد نہ ہوتا تو میں آپ کے ساتھ یہاں تک کیوں آتی؟ سنیے! اباجان نے عمل سے واپس آتے ہی مجھے بتایا تھا کہ ایاز انگریزوں کے ساتھ

بڑور کا سودا کر چکا ہے۔ کنڈاپور کے قلعہ دار نے اس کی ہدایات پر عمل کیا تھا۔ ایاز بڈور کے تمام قلعے انگریزوں کے قبضہ میں دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔"

مسعود علی کچھ دیر سکتے کے عالم میں رضیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "یہ خبر نہایت الم ناک ہے لیکن اس کے لیے آپ کو کنڈاپور جانے کی ضرورت تھی۔"

رضیہ نے کہا: "آپ نہیں جانتے، اس وقت بڈور کی تمام فوج مجھے تلاش کر رہی ہوگی۔ اباجان نے عمل سے آتے ہی یہ خبر ظاہر کیا تھا کہ وہ غدار اب زبوستی میجو سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے میرے لیے بھاگنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ اباجان

”جی ہاں۔“

”یہاں کر رہے ہو؟“

”فوج یہاں آگئی ہے اور ہم پٹاڑے کے گرد پہرہ دے رہے ہیں۔“

”قلعہ خالی ہو چکا ہے؟“

”جی ہاں! قلعے میں اب بے کے سوا کچھ نہیں رہا۔ ہم غروب آفتاب کے بعد

دہاں سے نکل آئے تھے۔“

مسعود علی اپنے بھائی کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس میں بولنے کی سکت نہ

تھی۔ رضیہ نے گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”صدیق علی خاں کہاں ہیں؟“

”وہ یہیں ہیں۔“ سپاہی نے جواب دیا۔

مسعود علی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں ان کے پاس لے چلو!“

”چلیے!“

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ صدیق علی خاں اور فوج کے چند افسروں کے سامنے کھڑے

تھے اور رضیہ انہیں ایاز خاں کی غدارگی کی داستان سنا رہی تھی۔ رضیہ کا بیان سننے اور

اور مسعود علی سے چند سوالات کرنے کے بعد صدیق علی نے کہا۔ ”مسعود تم بہت تھکے

ہوئے ہو لیکن تمہیں آج رات آرام نہیں ملے گا۔ تم باپچ ہماروں کے ساتھ اسی وقت

شیموگر کی طرف روانہ ہو جاؤ اور دہاں قلعے کے محافظ کو موجودہ صورت حالات سے خبردار

کردو۔ اسے میری طرف سے یہ پیغام دو کہ انگریز ملیبار اور بٹلر کے کسی ساتھی مقامات پر

فوجیں اتار چکے ہیں۔ ہم نے کنڈاپور اس وقت خالی کیا ہے جب کہ دشمن کی فوجیں قلعے کو

بلے کا ڈھیر بنا چکی تھیں اور ان کی فوج کنڈاپور کے شمال اور جنوب میں کئی مقامات پر اتار

چکی تھی اور ہمارے لیے رسد اور کمک کے تمام راستے بند ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو چکا

تھا۔ ہم قلعے کی توہین نکال کر حیدر گڑھ اور بٹلر لے جانا چاہتے تھے لیکن اب وہ شیموگر بھی

دی جائیں گی۔ اس وقت ہمارے ساحل کی کوئی چوکی محفوظ نہیں۔ ایاز خاں کی غدارگی کے

بعد ہمارے لیے بٹلر کو بچانا ممکن نہیں لیکن میں بٹلر کی طرف پیش قدمی کرنے والی فوج

پر عقب سے حملے کر کے اسے زیادہ سے زیادہ عرصہ کے لیے مصروف رکھنے کی کوشش

کردں گا۔ میرے پاس اس وقت صرف ساڑھے تین سو سوار اور آٹھ سو پیادہ سپاہی ہیں

زخمیوں کو ایک دستے کی حفاظت میں شیموگر روانہ کر دیا گیا ہے۔ ہمارے پاس بارود کی

کمی ہے۔ اس لیے جب تک کمک نہیں پہنچتی ہم دشمن کے عقب پر آگے دھکیلوں پر

اکٹھا کرتے رہیں گے۔“

مسعود علی نے کہا۔ ”آپ نے افتخار الدین کی ہمیشہ کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟“

صدیق علی نے جواب دیا۔ ”اب انتہت پور بھی زیادہ محفوظ نہیں۔ اس لیے

ہمیں شیموگر کو بھی اپنا فوجی مستقر بنانا پڑے گا۔ زخمیوں اور پناہ گزینوں کا قافلہ زیادہ دور

نہیں گیا ہوگا، میں رضیہ کو ان تک پہنچانے کا انتظام کر دیتا ہوں۔“ پھر وہ ایک افسر کی

طرف متوجہ ہوا۔ ”انہیں قافلے کے ساتھ شامل کرنا تمہارے ذمہ ہے۔ اپنے ساتھ چار

سپاہی لے کر ابھی روانہ ہو جاؤ!“

رضیہ نے کہا۔ ”میں یہیں رہ کر باجان کا انتظار کر دوں گی۔“

صدیق علی نے جواب دیا۔ ”ہم دو تین گھنٹے سے زیادہ یہاں نہیں ٹھہریں گے۔

میں نے کنڈاپور سے شمال کی طرف اترنے والی فوج کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے

جنگ جاسوس بھیجے ہیں اور ان کی طرف سے اطلاع ملے ہی ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

رضیہ نے کہا۔ ”میں لڑائی میں آپ کی فوج کا ساتھ دے سکتی ہوں۔“

”نہیں! ابھی ہماری بہنوں کے لیے توراہ ٹھانے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی ہماری

رگوں میں خون کے چند قطرے باقی ہیں۔“

رضیہ نے کہا۔ ”اگر آپ مجھے شیموگر بھیجنا ضروری سمجھتے ہیں تو مجھے قافلے کے

ساتھ بیچنا ضروری نہیں۔ میں آپ کے بھائی کے ساتھ سفر کر سکتی ہوں۔  
 آپ کو بہت تکلیف ہوگی، مسعود راستے میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں لے سکے گا۔  
 لیکن اگر آپ مسعود کا ساتھ دے سکیں تو اس سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ آپ شیوگا کے  
 قلعہ دار کو کسی اور کی نسبت زیادہ متاثر کر سکیں گی۔  
 رضیہ نے کہا۔ "مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اگر باہان آپ کے پاس پہنچیں  
 تو انہیں میرے متعلق بتا دیجیے۔"

صدیق علی نے کہا۔ بہت اچھا۔ مسعود علی اب تم انہیں لے کر روانہ ہو جاؤ!  
 مسعود علی کو روانہ کرنے کے دو گھنٹہ بعد صدیق علی کو جاسوسوں نے واپس آ  
 کر اطلاع دی کہ انگریزی افواج جنرل میتھیوز کی قیادت میں حسن گدی کے درے کے  
 قریب پہنچ کر پڑاؤ ڈال چکی ہیں۔ اس نے اپنی فوج کو کوچ کا حکم دیا۔  
 علی الصباح جب جنرل میتھیوز کی افواج درے کی ایک تنگ گھاٹی سے گزر  
 رہی تھیں۔ میسور کے سپاہیوں نے اس پاس کی چوٹیوں سے اچانک نمودار ہو کر ان کے  
 عقب کے دستوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ انگریزی فوج نے پلٹ کر حملہ کرنے کی  
 بجائے اپنی رفتار تیز کر دی۔ یہ درہ دفاعی لحاظ سے بہت مضبوط خیال کیا جاتا تھا۔ اور  
 سات میل تک جگہ جگہ توپیں نصب تھیں۔ صدیق علی نے اس امید پر دشمن کا تعاقب  
 جاری رکھا کہ شاید ایاز خاں کی غلاری کے باوجود کسی چوکی کے سپاہی دشمن کا راستہ  
 روکنے کی کوشش کریں لیکن اس کی یہ توقع عبث ثابت ہوئی۔ جنرل میتھیوز کے  
 لیے راستہ کھلا تھا۔ وہ عقب سے بار بار حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ الجھنا اپنے  
 لیے نقصان دہ سمجھتا تھا۔

صدیق علی کے سپاہی قریباً ڈیڑھ سو انگریزوں کو ہلاک اور زخمی کرنے کے بعد  
 ان کے بارود سے لڑے ہوئے چند خچر چھین چکے تھے لیکن جنرل میتھیوز کو ان نقصانات

کی پروا نہ تھی۔ انگریزی فوج درے سے نکل کر حیدر گڑھ کے قلعے میں داخل ہوئی حیدر گڑھ کے قلعے کے  
 ساتھ سو سی انٹوں میں سے اکثر ایاز خاں کے حکم کے مطابق بڑو پور پہنچے تھے۔ باقی قلعے کے دروازے  
 پر دشمن کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ یہ قلعہ ایک بلند مقام پر تھا اور اپنے محل وقوع  
 کے باعث ناقابل تہیج سمجھا جاتا تھا۔ اس میں پچیس توپیں نصب تھیں لیکن قلعہ دار  
 نے انہیں صرف دشمن کو سلامی دینے کے لیے استعمال کیا۔ حیدر گڑھ سے آگے بڑو  
 کارا مترا انگریزوں کے لیے کھلا تھا اور صدیق علی کے قتلے مانڈے سپاہیوں کے لیے  
 ان کا تعاقب جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔

۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء کی شام بڑو کے باشندے حسرت و یاس کے عالم میں قلعے  
 کے دروازے پر میسور کی بجائے انگریزوں کا جھنڈا دیکھ رہے تھے اور ایاز خاں کپتانی کی  
 فوج کے انڈرل کو بڑو کا سرکاری خزانہ تقسیم کرنے میں مصروف تھا۔



مسعود علی نے شوگا کے قلعے میں داخل ہوتے ہی کمانڈر سے ملاقات کی اور اس  
 نئے نئے حالات سے باخبر ہوتے ہی سلطان ٹیپو اور ملیار کی فوجی چوکیوں کے محافظوں  
 کو خبردار کرنے کے لیے اپنے ہر کارے روانہ کر دیئے۔ رضیہ کو اس نے اپنے مکان  
 میں جگہ دی۔

دو دن بعد کنڈاپور کے زخمیوں اور پناہ گزینوں کا قافلہ شوگا پہنچ گیا اور اس کے  
 ساتھ ہی قلعے کے محافظ کو یہ اطلاع ملی کہ بڑو اور حیدر گڑھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو  
 چکا ہے۔ چوتھے روز سلطان کی فوج کا ایک انڈر لطف علی چند دستوں کے ساتھ  
 چیل ڈرگ سے یلغار کرتا ہوا شوگا پہنچ گیا اور اس نے قلعے کے محافظ کو یہ خوشخبری  
 سنائی کہ سلطان کا لشکر بہت جلد پہنچے والا ہے۔

اسکے روز رضیہ قلعہ دار کے گھر میں عسکر کی نماز پڑھ رہی تھی کہ اسے باہر فوج

آ رہی ہے، فوج آرہی ہے، شور مچا دیا۔ وہ نماز ختم کر کے اٹھی اور قلعہ دار کی بیوی اور لوگوں کے ساتھ مکان کے دروازے میں کھڑی ہو کر وسیع احاطے کی طرف جھانکنے لگی۔ مسعود علی چند انہروں کے ساتھ صحن میں کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد صدیق علی گھوڑا دوڑاتا ہوا قلعے کے اندر داخل ہوا اور رضیہ اسے دیکھ کر اپنے دل میں غر شگوار دھڑکنے محسوس کر لے گی۔ پھر چند تانیے بعد سواروں کے دستے داخل ہو رہے تھے اور رضیہ کی نگاہیں ان میں اپنے باپ کو تلاش کر رہی تھیں مسعود علی بھاگتا ہوا آگے بڑھا۔ صدیق علی نے اسے دیکھ کر اپنا گھوڑا روکا اور نیچے اتر کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ رضیہ اپنے باپ کے متعلق سننے کے لیے بے تاب تھی اور اسے اپنا سانس بھی بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ مسعود علی کے ساتھ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد صدیق علی نے قلعہ دار اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔

رضیہ کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اچانک وہ مکان سے باہر نکل آئی اور تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی صدیق علی کی طرف بڑھی مسعود علی نے صدیق علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! رضیہ آرہی ہے۔ وہ اپنے باپ کے متعلق بہت پریشان ہے۔"

صدیق علی نے مڑ کر رضیہ کی طرف دیکھا اور رضیہ کے پاؤں اچانک زمین سے پویست ہو کر رہ گئے۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے صدیق علی کا منہم چہرہ دیکھ رہی تھی۔ صدیق علی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے کہا۔ رضیہ! مجھے انہوں سے کہیں تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔

ابا جان کہاں ہیں؟ رضیہ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

صدیق علی نے منہم لہجے میں جواب دیا۔ مجھے انہوں سے کہ میں انہیں

اپنے ساتھ نہیں لاسکا۔ اب وہ ہم سے بہت دور جا چکے ہیں۔ میں نے ان کا پتہ کرنے کے لیے بڑوں میں اپنا ایک جاسوس بھیجا تھا۔ تمہارے نوکروں نے اسے بتایا کہ انہوں نے اسی روز رات کے وقت بڑوں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن شہر سے تھوڑی دور ایاز خاں کے آدمیوں نے انہیں جالیا۔ وہ رات کی تاریکی میں مڑک چھوڑ کر ایک طرف بھاگنے لگے لیکن وہ گھوڑے سمیت ایک گھرے کھڈ میں جا گئے۔ ایک نوکر آخری وقت تک ان کے ساتھ تھا اور میرا جاسوس اس سے مل کر ان کی موت کی تصدیق کر چکا ہے۔"

رضیہ ایک سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ مسعود علی اور قلعہ دار آگے بڑھے قلعہ دار نے کہا۔ بیٹی! مجھے تمہارے باپ کی موت کا انہوں سے! رضیہ کوئی جواب دینے بغیر مڑی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی مکان کی طرف چل دی۔



عشاء کی نماز کے بعد قلعہ دار مسجد سے نکل کر اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا کہ صدیق علی نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ میں ناصر الدین کی صاحبزادی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

پہلے! میری بیوی کہتی تھی کہ اس نے اپنے باپ کی موت کی خبر سننے کے بعد سے کسی سے بات نہیں کی۔ اگر آپ اسے تسلی دے سکیں تو بہت اچھا ہوگا۔ صدیق علی قلعہ دار کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہوا۔ قلعہ دار نے ایک کمرے کے دروازے پر رکتے ہوئے کہا۔ "وہ اس کمرے میں ہیں۔"

صدیق علی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

کون ہے؟ اندر سے آواز آئی۔



”میں صدیق علی ہوں“  
 کمرے میں پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور پھر نیم ڈاکواری کی ادٹ سے رضیہ کی آواز آئی ”میرا خیال تھا کہ آپ کہیں جا چکے ہیں“  
 صدیق علی نے جواب دیا۔ ”میں اس قلعے میں پناہ لینے والے زخمیوں کی مزاج پرسی میں مصروف تھا لیکن اگر میں کہیں چلا گیا ہوتا تو بھی یہ کوئی غیر متوقع بات نہ ہوتی۔ جو حادثہ آپ پر گزرا ہے۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے لیکن کاش تلی کے افسانہ آپ کے زخموں کا مداوا بن سکتے۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ اب شوگا داراں کے آس پاس کوئی شہر یا قلعہ محفوظ نہیں۔ ہمیں ابھی تھوڑی دیر پہلے بڈنورا اور حیدر گڑھ سے انگریزی افواج کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی ہے لیکن ابھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی منزل مقصود کدھر ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ایک روز تک مجھے کسی اہم عاخذ پر جانا پڑے۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو کسی محفوظ جگہ پہنچا دیا جائے۔ مجھے آپ کے نوکر نے بتایا ہے کہ بنگلور میں آپ کے کوئی عزیز رہتے ہیں“  
 بنگلور میں ہمارے رشتہ دار ہیں لیکن میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد آج تک انھیں نہیں دیکھا۔ میں ان کا سہارا تلاش کرنے کی بجائے اس قلعے میں جان دینا آسان سمجھتی ہوں“  
 صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”اگر آپ کو کسی اور جگہ جانا پسند نہیں تو سرنگاپٹم میں ہمارے گھر کا دروازہ آپ کے لیے ہر وقت کھلا ہے، آپ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ میری امی جان آپ کی دلچسپی کر لیں گی۔ اگر آپ کو وہاں جانے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں کل ہی آپ کے سفر کا بندوبست کر دوں گا۔ آپ کا نوکر اور چند سپاہی آپ کے ساتھ جائیں گے“  
 صدیق علی رضیہ کی طرف سے کسی جواب کی بجائے دروازے کی ادٹ میں

اس کی سسکیاں سن رہا تھا اور یہ سسکیاں آہستہ آہستہ دہنی دہنی چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ قلعہ دار نے کہا۔ ”بیٹی! میں صدیق علی کے ابا جان کو جانتا ہوں۔ سرنگاپٹم میں ان کے گھر سے بہتر تھا کہ اس لیے کوئی اور جگہ پناہ نہیں ہو سکتی۔ شیوگا اب ہماری فوج کا مرکز بننے والا ہے۔ اس لیے میں بھی اپنے بچوں کو یہاں سے بھیج رہا ہوں۔“  
 قلعہ دار کا ایک نوکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور بولا۔  
 ”ایک افسر دروازے پر کھڑا ہے اور وہ آپ سے اسی وقت ملنا چاہتا ہے۔“  
 ”اسے ملاقات کے کمرے میں بٹھاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔“  
 نوکر چلا گیا تو قلعہ دار نے صدیق علی سے کہا۔ ”مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی اہم خبر سننے والے ہیں۔ آپ انھیں تسلی دیں میں اس سے پتہ چک رہا ہے۔“  
 قلعہ دار ملاقات کے کمرے کی طرف چل دیا اور صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”رضیہ اگر آپ کو ہمارے گھر جانے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کل ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں۔“  
 رضیہ نے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے میں یہ سوچ رہی تھی کہ اب اس دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ آپ شاید بہت رحمدل ہیں۔“  
 ”آپ کا مطلب ہے کہ میں پتھر نہیں ہوں۔“  
 رضیہ نے کہا۔ ”کاش میں آپ کی فوج میں شامل ہو کر اپنے بھائی اور باپ کا انتقام لے سکتی۔“  
 صدیق علی نے جواب دیا۔ ”آپ کے بھائی اور ابا جان کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔“  
 قلعہ دار کا نوکر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا۔ ”وہ آپ کو بلا رہے ہیں انگریزوں

ایکلی ہوں۔ میں اب افتخار الدین کی بہن اور ناصر الدین کی بیٹی نہیں ہوں۔ اب میرے لیے بڑنور کے گواہ اہل نہیں ہے۔ میں ایک بے بس لڑکی ہوں۔ صدیق علی مجھے اپنے ساتھ ہی لے چلو۔ میں گولیوں کی بارش میں تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔“

رضیہ کے دل دماغ میں ایک بیجان برپا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی تو اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے وہ قلعے کے صحن میں داخل ہوئی صدر دروازے پر سپاہیوں کی آوازیں اور قلعے سے باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دے رہی تھی۔ رضیہ کی حالت اس مسازگی تھی جس کا قافلہ اسے صحرائیں نہما چھوڑ کر آگے جا چکا ہو۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا اور دم بھرنے کے لیے تاریک فضا میں نور کے خزانے بکھیر کر روپوش ہو گیا۔ اچانک اسے کسی کی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“

رضیہ نے قلعہ دار کی آواز پہچانتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں۔ میں رضیہ ہوں۔ صدیق علی کہاں ہیں؟“

”وہ ایک مہم پر جا چکے ہیں لیکن آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔ چلیے اندر، وہ مجھے آپ کے متعلق تاکید کر گئے ہیں۔ آپ کے سفر کا بندوبست ہو جائے گا۔ اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔“

”وہ کہاں گئے ہیں؟“

”وہ اننت پور گئے ہیں۔ ابھی اننت پور کی فوج کا ایک افسر یہاں پہنچا تھا اور اس نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ انگریزوں کی فوج اننت پور کا رخ کر رہی ہے اور بڑنور کا گورنرواں کے سپاہیوں کو یہ ہدایت بھیج چکا ہے کہ قلعہ کسی مزاحمت کے بغیر انگریزوں کے حوالہ کر دیا جائے۔ صدیق علی تین سو سواروں کے ساتھ روانہ ہو چکا ہے اگر وہ وقت پر پہنچ گیا تو مجھے یقین ہے کہ اننت پور کا قلعہ بچا سکے گا۔“

کی پیش قدمی کے متعلق کوئی اہم خبر آئی ہے۔“

صدیق علی نے کہا۔ رضیہ! کاش میرے پاس باتوں کے لیے وقت ہوتا اگر مجھے اسی وقت کسی مہم پر جانا پڑتا تو میری غیر حاضری میں قلعہ دار تمہارے سفر کا بندوبست کر دے گا۔ اس کے بعد اس نے نوکر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”چلو!“

رضیہ چند منٹ کواڑے لگی کھڑی رہی۔ پھر اپنے بستر کے قریب ایک موڑھے پر بیٹھ گئی۔ سرنگا پٹم میں صدیق علی کے والدین اور اس کے گھر کی مختلف خیالی تصویریں اس کے ذہن میں آ رہی تھیں۔ کبھی اسے یہ خیال آتا کہ جب جنگ کے بعد سپاہی اپنے گھروں کو لوٹیں گے تو وہ صدیق علی اور مسعود کی ماں کے ساتھ بالکنی میں کھڑی ان کی راہ دیکھ رہی ہوگی اور اس کی نگاہوں کے سامنے امیدوں کے چراغ روشن ہو جاتے۔ اور کبھی وہ سوچتی کہ میدان جنگ سے کوئی ایچی ایک عمر رسیدہ ماں کو آکر یہ پیغام دے گا کہ تمہارے جواں سال بیٹے لڑائی میں کام آچکے ہیں اور اس کی نگاہوں کے سامنے

بھیانک تاریکیاں چھا جائیں۔ جہاں پر صدیق علی کے ساتھ ابتدائی طاقات کو وہ ایک اتفاقی حادثہ کبھی بھی لیکن کنڈاپور سے رخصت ہوتے وقت اسے انوس تھا کہ ان کے راستے ایک دوسرے سے اتنی جلدی جدا ہو گئے ہیں تاہم یہ احساس اتنا شدید نہ تھا کہ وہ مڑ کر پیچھے دیکھتی لیکن اب دنیا بدل چکی تھی اور صدیق علی اس کے لیے زندگی کا آخری سہارا بن چکا تھا۔ اپنے بھائی اور اپنے باپ کی موت کے بعد وہ بار بار یہ سوچ رہی تھی کہ اگر صدیق علی نہ ہوتا تو یہ دنیا میرے لیے کتنی تاریک ہوتی!

وہ دیر تک اپنے ماضی، سال اور مستقبل کے متعلق سوچتی رہی۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد اسے قلعے کے صحن میں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور اس کا دل بیٹھے لگا صدیق علی کہیں جا رہا ہے۔ صدیق علی کسی خطرناک مہم پر جا رہا ہے، شاید وہ واپس نہ آئے۔ نہیں! نہیں! صدیق علی تم مت جاؤ، اب دنیا میں میرا کوئی نہیں، میں

”ان کا بھائی کہاں ہے؟“

”وہ بھی فوج کے ساتھ جا چکا ہے لیکن وہ آپ کو سرنگا پٹم پہنچانے کے لیے تین سپاہی چھوڑ گئے ہیں۔ صدیق علی نے اپنے والد کے نام ایک مختصر سا خط لکھ کر آپ کے نوکر کو دیا تھا۔“

رضیہ نے کہا: ”اگر آپ مجھے ضرور بھیجنا چاہتے ہیں تو میں اسی وقت یہاں سے روانہ ہونا چاہتی ہوں۔“

”یہ وقت موزوں نہیں۔ آپ رات آرام کریں۔ صبح دیکھا جائے گا۔“

”رضیہ نے قدمے وقت کے بعد کہا۔“ انتہت پور میں ان کی ہم زیادہ خطرناک

تو نہیں؟“

”انتہت پور کا قلعہ ہمارا مضبوط ترین قلعہ ہے۔ وہاں ساٹھ بڑی توپیں نصب ہیں۔ اگر صدیق علی کے سپینے سے پہلے غداروں نے اسے دشمن کے حوالے نہ کر دیا تو ہم انگریزوں سے بڑھ کر اور حیدر گڑھ کی شکست کا بدلہ لے سکیں گے۔“

رضیہ نے کہا: ”میں پچھلے پہر یہاں سے روانہ ہو جاؤں گی اور اس وقت آپ کو جگانا مناسب نہ ہوگا۔ اس لیے آپ سونے سے پہلے میرے ساتھ جانے والے سپاہیوں کو ہدایت کریں کہ وہ پچھلے پہر تیار رہیں!“

”بہت اچھا! لیکن اگر آپ ایک دن اور ٹھہر سکیں تو ممکن ہے پرسوں تک میں آپ کے ساتھ ہی اپنے بال بچوں کو بھی روانہ کر دوں۔“

”نہیں! میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔“ رضیہ یہ کہہ کر واپس مڑی۔ قلعہ دار کے مکان کے سامنے اسے اپنا نوکر دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر بولا: ”میں آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ صدیق علی خاں کہیں چلے گئے ہیں وہ تاکید کرتے تھے کہ ہم یہاں سے فوراً سرنگا پٹم روانہ ہو جائیں۔ انہوں نے اپنے والد کے نام مجھے یہ خط

لکھ کر دیا تھا۔ لیجیے!“

رضیہ نے کاغذ کا پرزہ اپنے نوکر کے ہاتھ سے لے لیا اور کہا: ”میں ابھی قلعہ دار سے مل چکی ہوں۔ تم جا کر تیاری کرو ہم پچھلے پہر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

تھوڑی دیر بعد رضیہ اپنے کمرے کے اندر چراغ کی روشنی میں صدیق علی کا مختصر سا خط پڑھ رہی تھی:-

”اباجان اور امی جان! میں ایک بے سہارا لڑکی کو آپ

کے پاس بھیج رہا ہوں۔ میرے پاس تفصیلات بیان کرنے کا

وقت نہیں۔ رضیہ کو آپ کی محبت، شفقت اور نیک دعاؤں

کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اسے مایوس نہیں کریں گے۔

آپ کا بیٹا

صدیق علیؑ

صدیق علی انتہت پور کے قلعے کے دروازے کے برج پر کھڑا مغرب کی سمت

انگریز سواروں کی فوج دیکھ رہا تھا۔ ان کے براہ اول دستے معمولی رفتار سے قلعے کی

طرف بڑھ رہے تھے۔ سب سے آگے ایک سوار سفید جھنڈا بلند کیے ہوئے تھا۔

تھوڑی دیر بعد یہ سوار قلعے کی توپوں اور بندوقوں کی زد میں آچکے تھے صدیق علی

کے اشارے پر چند سپاہیوں نے ہوائی فائر کیے۔ اس کے بعد ایک توپ چلائی گئی

اور انگریز فوج جو اطمینان سے آگے بڑھ رہی تھی، رگ گئی، چند منٹ بعد انگریزی

فوج کے پیر سوار، جن میں سے ایک کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا، گھوڑے سے اترتے

ہوئے قلعے کے دروازے کے قریب پہنچے اور ان میں سے ایک نے جو فوج کا کوئی

بڑا افسر معلوم ہوتا تھا، بلند آواز میں کہا: ”سفید جھنڈے پر گولی چلانا جنگ کے

اسلوبوں کے خلاف ہے۔ تمہارا کمانڈر ہمارے ساتھ و مدد کر چکا ہے کہ وہ قلعہ ہمارے

حوالہ کر دے گا۔ اگر کمانڈر کی نیت بدل گئی ہے تو یہ اس معاہدے کی خلاف ورزی ہو گی جو بٹور کے گورنر نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔“

صدیق علی نے جواب دیا: ”بٹور کا گورنر حکومت میسور کا غدار ہے اور اس کمانڈر کو چھانسی دی جا چکی ہے۔ جس نے ایک غدار کے حکم کی تعمیل کا ارادہ کیا تھا۔ ہم نے تمہارے سفید بھنڈے پر گولی نہیں چلائی بلکہ تمہیں خبردار کیا تھا کہ تم اس امید پر تلے کی توپوں کی زد میں آنے کی کوشش نہ کرو کہ یہاں سب غدار بستے ہیں۔“

انگریز افسر نے کہا: ”ایاز خاں نے بٹور کے گورنر کی حیثیت سے اس کے قلعے کے متعلق ہمارے ساتھ معاہدہ کیا ہے اور میسور کی حکومت اپنے ایک بااختیار گورنر کی طرف سے کیے گئے معاہدوں کی پابند ہے۔“

”بٹور کے گورنر کی سرکاری حیثیت اس دن ختم ہو گئی تھی۔ جب اس نے تمہارے ساتھ بٹور اور حیدر گڑھ کا سودا کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک غدار ہے۔“

”ہم تمہیں خبردار کرتے ہیں کہ تم غلطی کر رہے ہو۔ تم چند گھنٹوں سے زیادہ ہمارے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ہم تمہیں پندرہ منٹ سوچنے کے لیے مہلت دیتے ہیں۔ اس کے بعد اگر تم نے مزاحمت کی تو ہم بے رحمی کے جرم میں اس قلعے کے کسی سپاہی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

صدیق نے جواب دیا: ”اگر تم دو منٹ کے اندر اندر واپس نہ چلے گئے تو میں سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دے دوں گا۔“

انگریز سپاہیوں نے چند ثانیے آپس میں کچھ باتیں کیں اور اس کے بعد اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ لیں۔

اچانک صدیق علی کو دائیں طرف حدنگاہ پر چند سوار دکھائی دیئے۔ اس نے ایک افسر کے ہاتھ سے دو درہن لی اور افاق کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ ہمارے آدمی معلوم ہوتے ہیں اس نے بندہ آواز میں کہا۔“

تھوڑی دیر بعد اسے پانچ سوار اچھی طرح دکھائی دینے لگے اور پھر اچانک وہ اپنے دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔ چند ثانیے غور سے دیکھنے کے بعد اس نے دو درہن نیچے کرتے ہوئے اپنے بھائی کی طرف دیکھا اور کہا: ”مسعود! رضیہ نے میرا کمانہاں مانا، نیچے جا کر پہرہ داروں سے کہو کہ وہ انہیں اندر آنے دیں۔ انگریز محاصرے کے لیے اپنی صفیں درست کر رہے ہیں اور ابھی شاید ان کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوئی لیکن ممکن ہے کہ وہ انہیں قلعے میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کریں!“

مسعود علی جلدی سے نیچے اتر گیا اور صدیق علی اضطراب کی حالت میں کبھی اپنے بائیں ہاتھ انگریزوں کی فوج کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی دائیں جانب قلعے کی سمت آنے والے پانچ سواروں کی طرف۔ اب وہ دو درہن کے بغیر بھی رضیہ اور اس کے ساتھیوں کو پہچان سکتا تھا۔ اچانک انگریزوں کی فوج کے چند سوار گھوڑے جھگاتے ہوئے آگے بڑھے اور انہوں نے رضیہ اور اس کے ساتھیوں کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی لیکن فیصل پر سے گولیوں کی بارش کے باعث انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگریز سپاہیوں نے جواب میں گولیاں برسائیں لیکن اتنی دیر میں رضیہ اور اس کے ساتھی قلعے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ صدیق علی جھانگتا ہوا صحن میں پہنچا۔ اسے اپنے جذبات کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ رضیہ کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ چند ثانیے اسے اس بات کا احساس نہ ہوا کہ وہ اپنی لوگوں کے درمیان کھڑی ہے۔ پھر اس نے صدیق علی کی طرف دیکھا اور جلدی سے گردن نیچی کر کے اپنا نقاب درست کرنے لگی۔ مسعود علی نے اسے گھوڑے سے اترنے کے لیے سہارا دیا اور صدیق علی نے آگے بڑھ کر کہا: ”رضیہ تم نے بہت برا کیا۔ اس قلعے میں چار سوار تھے اور نیچے پہلے ہی پناہ لے چکے ہیں اور خدا معلوم اس کی دیواریں کب تک دشمن کی گولہ باری کے سامنے ٹھہریں گی۔“

رضیہ نے جواب دیا: میں اس قلعے میں پناہ لینے نہیں آئی۔ آپ میرا نام اپنے سپاہیوں میں شمار کر سکتے ہیں:

صدیق علی نے کہا: "اگر آپ عورتوں اور بچوں کی خبر گیری کر سکیں تو میں اسے غنیمت سمجھوں گا۔ مسعود انہیں خرابیوں کے پاس پہنچا دو!"

"پہلے!" مسعود علی نے کہا اور رضیہ کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ قلعے کے اس حصے کی طرف چل پڑی جہاں عورتیں اور بچے ٹھہرے ہوئے تھے۔

صدیق علی نے اپنے انہروں اور سپاہیوں کی طرف دیکھا اور کہا: "میرے دوستو! ہمارے عزم اور استقلال کے امتحان کا وقت آ پہنچا ہے۔ میں یہ ہدایت لے کر آیا ہوں کہ جب تک ہمارا لشکر یہاں نہیں پہنچتا اس قلعے کی برقیہ پر حفاظت کی جائے۔ اگر یہ قلعہ دشمن کے قبضے میں چلا گیا تو یہ تمام علاقہ خطرے میں پڑ جائے گا۔ انگریزوں کو فتوحات کا شوق ہزاروں میل دور سے یہاں تک لے آیا ہے۔ اس نے سات مندر پار اپنی قوم کی سطوت کے پرچم لہرانے کے لیے ہمارے ساتھ جنگ مول لی ہے اور اس جنگ میں فتح یا شکست اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں لیکن ہم اپنی عزت، اپنی آزادی اور اپنے بقا کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہمیں زندہ رہنے کے لیے اپنے دشمنوں کے سامنے یہ ثابت کرنا ہے کہ تم جس جنگ میں شکار کھیلنے آئے ہو، وہاں بیٹھ کر یوں کے روز نہیں شیر بستے ہیں۔ ایک سپاہی کی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے جب اسے فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر اپنی جان کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ اننت پور میں ہماری جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لیکن جسے ہمیں بردت کند پہنچ جائے اور ہم دشمن کو ذلیل کر مند کی طرف لے جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم وطن کی آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ دونوں صورتوں میں ہماری آئندہ نسلیں ہمارے متعلق یہ نہیں کہہ سکیں گی کہ ہم نے ذلت کا راستہ اختیار کیا تھا۔ میں تمہیں

اس بات کا یقین دلا سکتا ہوں کہ اس قلعے کے ہر سپاہی کی قربانی قوم کے ہزاروں افراد کو تباہی اور بربادی سے بچا سکے گی۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ دشمن ہماری لاشیں روکنے سے بغیر اننت پور سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

ایک گھنٹہ بعد لڑائی شروع ہو چکی تھی اور انگریزوں کی توپیں چاروں طرف سے قلعے پر گولہ باری کر رہی تھیں۔ قلعے میں بارود کے ذخیرے کا اندازہ لگانے کے بعد صدیق علی سپاہیوں کو یہ ہدایت دے چکا تھا کہ وہ اندر ضرورت کے بغیر فارغ نہ کریں۔ تیسرے پہر انگریزوں نے چاروں طرف سے قلعے پر دھاوا بولنے کی کوشش کی لیکن قلعے کی توپوں نے پہلی بار پوری شدت سے گولہ باری کی اور حملہ آوروں کو شدید نقصان اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کے بعد دشمن صرف اپنے توپخانے سے گولے برسائے پراکتا کرتا رہا۔ غروب آفتاب کے وقت صدیق علی اپنی آنکھوں سے دور بین لگائے قلعے کے ایک برج پر کھڑا تھا۔ قلعے کے گرد دشمن کی تعداد پہلے سے زیادہ ہو چکی تھی اور وہ چاروں طرف چھوٹی توپوں کی جگہ بھاری توپیں نصب کر رہے تھے۔ مغرب کی اذان سن کر صدیق علی فیصل سے نیچے اترا اور نمازیوں کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ اچانک باہر سے توپ کا ایک گولہ فیصل کے ایک برج پر لگا اور اس کے ریزے اڑ کر صحن میں آگے۔ پھر پوری شدت کے ساتھ چاروں طرف سے گولہ باری ہونے لگی۔ نماز ختم کرنے کے بعد سپاہی اور انہر اپنے اپنے مورچوں میں کھڑے ہو گئے۔

یہ رات قیامت کی رات تھی۔ دشمن کا توپخانہ زانہ دھند آگ برسا رہا تھا۔ قلعے کے کئی برج ٹوٹ چکے تھے۔ چھتوں اور فیصلوں میں جگہ جگہ شگاف پڑ چکے تھے۔ کسی سپاہی زخمی اور شدید ہو چکے تھے۔ پچھلے پہر صدیق علی فصل کا جگہ لگانے کے بعد نیچے اترا اور ایک سپاہی کے ہاتھ سے مشعل لے کر قلعے کے اندر گشت کرنے لگا جگہ جگہ

اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھنے کے بعد وہ ایک وسیع کمرے میں داخل ہوا جہاں چند عورتیں زخموں کی تیمارداری کر رہی تھیں۔ کمرے کے ایک سرے پر ایک سپاہی جس کی تیس غن سے ترستی، درد سے کراہ رہا تھا اور رضیہ اس کے سر پر پٹی باندھ رہی تھی۔ صدیق علی اس کے قریب پہنچ کر رکا۔ رضیہ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔ صدیق علی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے غلے سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ دالیں مڑا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ فضیل پر پہنچا اور چاروں طرف چکر لگانے اور سپاہیوں کو ہدایات دینے کے بعد دروازے کے قریب ایک برج کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ رات کی آدھی میں کھمبے کے چاروں طرف توپوں کے دہانوں سے آگ کے شعلے اڑ رہے تھے اور پھلکھلا سے زیادہ ہیب معلوم ہوتے تھے۔ اچانک اسے اپنے قریب کسی کی دبی دبی سسکیاں سنائی دیں۔

”کون ہے؟“ اس نے چونک کر سوال کیا۔

”میں ہوں رضیہ، کسی نے گھٹی ہوئی سنوائی میں جواب دیا۔“

”آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“

”کچھ نہیں! اس نے جواب دیا۔ ”آپ مجھ سے خفا ہیں؟“

صدیق علی نے جواب دیا۔ ”میں تم سے خفا نہیں ہوں رضیہ! لیکن تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

لیکن یہاں سیکڑوں عورتیں موجود ہیں۔ میرے آنے سے کیا فرق پڑے گا؟  
صدیق علی نے جواب دیا۔ ”یہ عورتیں اننت پور کی طرف دشمن کی اچانک پیش قدمی کے باعث مجبوری کی حالت میں یہاں جمع ہو گئی ہیں لیکن تمہارے لیے ایسی کوئی عبوری زمینی۔ میں نے تمہیں اپنے گھر پہنچانے کا انتظام کر دیا تھا۔“

رضیہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”یہاں آکر مجھے موت کا ڈر نہیں میرے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ آپ مجھ سے خفا ہوں۔“

”میں تم سے خفا نہیں رضیہ! لیکن کاش میں تمہیں یہ سمجھا سکتا کہ ہم یہاں زندگی کی بجائے موت سے زیادہ قریب ہیں۔ دشمن اپنی پوری قوت یہاں جمع کر رہا ہے۔ خدا معلوم کل تک وہ کتنی اور بڑی توپیں اس قلعے کے سامنے نصب کر دے گا۔ ہمارا بارود کا ذخیرہ اب زیادہ سے زیادہ ایک دن اور چلے گا۔ میرے سپاہیوں کے حوصلے بلند ہیں لیکن عورتوں اور بچوں کا مسئلہ ہمارے لیے بہت پریشان کن ہے۔ کاش تم میرا کہا مانتیں!“

رضیہ نے کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں کہ میں یہاں کیوں آگئی ہوں۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ ہماری منزل ایک ہے اور ہمارے رستے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔“

صدیق علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”رضیہ تم صرف اس لیے یہاں آئی ہو کہ میں یہاں تھا؟“

صدیق علی کو جواب میں الفاظ کی بجائے سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ اس نے کہا۔ ”رضیہ سچ کو تمہارے دل میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں شاید اننت پور سے دالیں آکر تمہیں نہ دیکھوں؟“

رضیہ کی سسکیاں اچانک بند ہو گئیں اور اس نے چند نایبے وقت کے بعد جواب دیا۔ ”مجھے صرف اس بات کا احساس تھا کہ آپ کسی خطرناک ہم پر روانہ ہو چکے ہیں اور میں خطرے کے وقت آپ سے دور رہنا نہیں چاہتی تھی۔ آپ میری حفاظت کے خیال سے مجھے سزا دیا تم بھیجنا چاہتے تھے لیکن آپ کے بغیر میرے لیے زندگی کے کوئی معنی نہ تھے۔“

اچانک نیچے صحن سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔ "کماندار صاحب! کماندار صاحب!!  
صدیق علی نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ "میں یہاں ہوں کیا بات ہے؟"  
"مسعود علی خاں زخمی ہو گئے ہیں، آپ نیچے آئیں۔"

صدیق علی کا دل ٹھٹھ گیا۔ وہ جلدی سے نیچے اتر اور سپاہی کے ساتھ جھانکا ہوا  
ایک کمرے میں داخل ہوا۔ مسعود علی جانمندی کے عالم میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے  
سے خون کا ذراہ چھوٹ رہا تھا۔ چند سپاہی اس کے گرد کھڑے تھے اور رضیہ ایک کتے  
کے عالم میں اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

"مسعود! مسعود!!" صدیق علی نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے کہا۔ مسعود علی  
کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر چند ثانیہ بعد اس نے آنکھیں  
بند کر کے گردن ڈھیلی چھوڑ دی۔ رضیہ کی پتھرائی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب  
پھوٹ نکلا۔

ایک افسر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے صدیق علی کے قریب آکر کہا۔  
"جناب اب صبح ہو رہی ہے اور دشمن کی نقل و حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قلعے  
پر دھاوا بولنے کا ارادہ کر رہا ہے۔"

دن کے آٹھ بجے تک قلعے کی فصیل جگہ جگہ ٹوٹ چکی تھی۔ اندر کئی مکان بیلے  
کے ڈھیر بن چکے تھے۔ لڑنے والے سپاہیوں کی نسبت زخمی اور شہید ہونے والے  
مجاہدوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سپاہیوں کے علاوہ کئی عورتیں اور بچے گرتی ہوئی چھتوں کے  
بلے کے نیچے دب کر ہلاک ہو چکے تھے۔ دوپہر کے وقت دشمن نے ایک بار پھر قلعے پر لڑائی  
کرنے کی کوشش کی لیکن قلعے کے محافظوں نے توپوں اور ہندوؤں کی شدید فائرنگ سے  
انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ قلعے کے محافظوں کی یہ کامیابی بھتے ہوئے چراغ کی آخری

اچانک ایک خوفناک دھماکا سنانی دیا اور اس کے بعد برج کے ایک ستون اور  
پھلت کی کچھ اینٹیں نیچے گر پڑیں۔ پھر بیک وقت ایک کی زبان سے "رضیہ" اور دوسرے  
کی زبان سے "صدیق علی" کے الفاظ نکلے اور وہ اضطراب کی حالت میں ایک دوسرے  
کی گرفت میں آپکے تھے۔

رضیہ تم ٹھیک ہونا؟

میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں آپ کے متعلق ڈر گئی تھی۔ آپ کو کوئی چوٹ تو

نہیں آئی؟

صدیق علی نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ "رضیہ تم نیچے چلی جاؤ  
"بھائی جان! بھائی جان!" چند قدم کے فاصلے سے مسعود علی کی آوازیں سنانی

دیں۔

کیا ہے مسعود؟

مسعود تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور بولا۔ "بھائی جان یہ برج گر رہا ہے

آپ ایک طرف ہٹ جائیں۔

"بہت اچھا! تم رضیہ کو نیچے لے جاؤ؟"

مسعود نے رضیہ کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے کہا: "آپ یہاں

کیا کر رہی ہیں، چلیے؟"

رضیہ کچھ کے بغیر اس کے ساتھ فصیل سے نیچے اتر آئی۔

صدیق علی آہستہ آہستہ فصیل پر چلتا ہوا آگے بڑھا۔ سپاہی اپنی اپنی جگہ پر  
کھڑے تھے اور صدیق علی کو ان کا سکوت چھوڑنے سے زیادہ اضطراب انگیز محسوس ہوتا  
تھا۔ دشمن کی گولہ باری ہر لحظہ شدت اختیار کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ فصیل کے دوسرے حصے پر ایک افسر سے باتیں کر رہا تھا کہ

کہا۔ رضیہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں ایک کامیاب جہازوں  
بچوں اور منگولوں سے رونا ہوتے وقت یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ  
مجھے اچانک بڑی فرح کا ایک افسر بنا دیا جائے گا۔ جب تم جہاز پر سوار ہوتی تھیں تو  
اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ قدرت نے ہمیں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں  
سننے کے لیے انتہا پور کا قطعہ منتخب کیا ہے۔

رضیہ نے کہا۔ "میں آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں اور وہ یہ کہ آپ کسی جگہ  
پر مجھے اپنی نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کا حکم نہیں دیں گے۔"

صدیق علی نے کہا۔ "اگر چند گھنٹوں تک ہمیں کوئی لگک نہ پہنچی تو بچوں اور عورتوں  
کی خاطر ہم ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اگر دشمن انہیں یہاں سے نکلنے کا موقع دینے  
پر رضامند ہو گیا تو میں اپنے بچے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ان کی قید میں جانا قبول کر لوں  
گا، اگرچہ ان کی قید ہمارے لیے موت سے بدتر ہوگی۔ بہر حال ان حالات میں اس  
قلعے کے کمانڈر کی حیثیت میں میرا جو حکم بانی عورتوں اور بچوں کے لیے ہوگا وہی  
تمہارے لیے ہوگا۔"

رضیہ نے پامید ہو کر کہا۔ "ایسا وقت آنے پر میں آپ کے حکم کی تعمیل سے  
انکار نہیں کروں گی اور مجھے یقین ہے کہ میری زندگی میں ایسا وقت نہیں آئے گا۔"  
شام کے وقت قلعے کے بانی افسر صدیق علی سے یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارا بارود  
اب بالکل ختم ہو چکا ہے، اگر متوسّی دیر تک کوئی لگک نہ آئی تو ممکن ہے کہ رات کے  
وقت دشمن کسی مداخلت کے بغیر قلعے میں داخل ہو جائے۔"

صدیق علی نے جواب دیا۔ "اب ہمارا مقصد لڑائی میں دشمن کو زیادہ سے زیادہ  
دیر یہاں مسدوف رکھنا ہے۔ ہمیں یہ رات گزارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"  
رات کے وقت قلعے کی توپوں کو خاموش رکھ کر انگریز اپنی توپیں اور قریب

لوتھی۔ ان کا بارود ختم ہو چکا تھا اور صدیق علی انہیں یہ حکم دے چکا تھا کہ اب توپوں سے  
کام نہ لیا جائے، اب اگر دشمن نے دوبارہ حملہ کیا تو بند توپیں، انیز سے اور توپوں ہمارا  
آخری سہارا ہوں گی۔

تیسرے پہر دشمن کی پیادہ فرج اپنے توپخانوں کی گولہ باری کے ساتھ آہستہ آہستہ  
آگے سرک کرتے ہوئے تیار کر رہی تھی۔ صدیق علی فیصل کے ایک مورچے میں بیٹھا دشمن  
پر گولیاں برساتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فائر کرنے کے بعد اپنی بندوق بھرنے لگا تو کسی نے اسے  
اپنی بندوق پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لیجیو! یہ بھری ہوئی ہے۔ خالی بندوق مجھے  
دے دیجیو! میں بارود اور گولی ڈالنا چاہتی ہوں۔"

یہ رضیہ تھی۔ صدیق علی نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے بندوق لے لی اور وہ  
اس کے قریب بیٹھ کر خالی بندوق بھرنے لگی۔ صدیق علی نے نشانہ بانڈھتے ہوئے کہا۔  
"رضیہ! ہماری منزل شاید اب بہت قریب آچکی ہے۔ ہزاروں باتیں ایسی ہیں جو میں  
تم سے کہنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تمہارے پاس بیٹھ کر مسعود کے متعلق باتیں کر دوں اور  
تھیں یہ بتاؤں کہ اس کا بچپن اور جوانی کیسی تھی۔ وہ مجھے کس قدر عزیز تھا۔ اس کی شہادت  
سے سٹوڈی دیر قبل میں یہ تصور کر رہا تھا کہ ہم سرنگا۔ تم پہنچ چکے ہیں۔ ہم دریلے کا دیری  
کے کنارے سر کر رہے ہیں۔ میں اپنے ابا جان اوسامی جان کو تمہارے متعلق بتا رہا ہوں  
اور میرے چھوٹے بھائی تمہیں حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔"

رضیہ بولی۔ "اور میں شاید اس وقت آپ کے ساتھ کسی جہاز پر سفر کر رہی تھی۔ ہم  
کسی ایسے جہاز سے کی طرف جا رہے تھے جہاں انسانیت جنگوں کے آلام و مصائب سے  
آزاد ہے۔ جہاں ملت درویش اپنے وطن کی آزادی اپنی قوم کے دشمنوں کے ہاتھوں فروخت  
نہیں کرتے۔"

صدیق علی نے فائر کرنے کے بعد رضیہ کے ہاتھ سے بھری ہوئی بندوق لیتے ہوئے



لا چکے تھے اور ان کی گولہ باری کے اثرات پہلے سے کہیں زیادہ تباہ کن تھے۔ جس مورچے میں صدیق علی بیٹھا ہوا تھا اس کے ارد گرد فصیل کا کچھ حصہ منہدم ہو چکا تھا۔ اس نے رضیہ کو بڑے اصرار کے بعد نیچے جانے پر رضامند کیا۔ وہ عورتوں کے ایک کمرے میں جا کر لیٹ گئی اور تھوڑی دیر بعد اس پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا۔

رات بھر کی گولہ باری کے بعد صبح کی روشنی میں اننت پور کا قلعہ ویرانی اور بربادی کا ایک دلخراش منظر پیش کر رہا تھا۔ قلعے کے محافظ اپنی آخری گولی چلا چکے تھے۔ صدیق علی نے حسرت دیاں کے عالم میں چاروں طرف دیکھا اور ایک سپاہی کو فصیل سے سفید جھنڈا ہرانے کا حکم دیا۔ دشمن کی توپیں اچانک خاموش ہو گئیں صدیق علی گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا اور قلعے سے کوئی پچاس گز دور جا کر رک گیا۔ دشمن کی صفوں سے سواروں کا ایک دستہ نکلا اور ان کی آن میں صدیق علی کے قریب آکا۔ صدیق علی نے کہا: "میں آپ کے کمانڈر کے پاس پریش کش لے کر آیا ہوں کہ اگر آپ اس قلعے میں پناہ لینے والی عورتوں اور بچوں کو نکل جانے کا موقع دیں تو ہم یہ قلعہ آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

ایک انگریز افسر نے جواب دیا: "تمہیں یہ درخواست لے کر کمانڈر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے کمانڈران لوگوں سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے جنہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہمارے صلح کے جھنڈے پر نازنگ کی تھی۔ اگر تم غیر مشروط پر ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہو تو گولہ باری پھر دوبارہ شروع کر دی جائے گی اور قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد تمہیں بدترین سلوک کا مستحق سمجھیں گے۔"

صدیق علی نے کہا: "جس شخص نے اس قلعے کے متعلق آپ کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا تھا، وہ مسیور کا نذر تھا۔"

افسر نے کہا: "ہم تمہارے ساتھ بحث میں الجھنا پسند نہیں کرتے۔ تم واپس جا سکتے ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم تمہاری مزاحمت کے باوجود ایک گھنٹے کے اندر اندر اس قلعے پر قبضہ کر لیں گے۔"

صدیق علی نے مایوس ہو کر کہا: "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر تم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دین تو آپ عورتوں اور بچوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

افسر نے جواب دیا: "تمہارے ہتھیار نہ ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں معلوم ہے کہ تمہارا بارود ختم ہو چکا ہے اور تم نے اس وقت صلح کا جھنڈا بلند کیا ہے جب تمہارے لیے کوئی اور راستہ باقی نہیں رہا۔ تم ہمارا وقت ضائع نہ کر دو تمہاری بہتر ہی اسی میں ہے کہ تم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دو۔ عورتوں اور بچوں کے ساتھ زیادتی کرنا ہماری شان کے شایان نہیں لیکن ہم ان کے متعلق تمہارے ساتھ کوئی بات کرنے پر آمادہ نہیں تم با سکتے ہو۔"

صدیق علی نے مڑ کر قلعے کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر اپنی کمر سے تلوار اتار کر انگریز افسر کو پیش کر دی۔

تھوڑی دیر بعد انگریزی فوج فتح کے نثار سے بجاتی قلعے کے اندر داخل ہوئی انگریز کمانڈنٹ کے حکم سے قلعے کے محافظوں کو جن میں سے بیشتر زخمی تھے، غیر مسلح کر کے ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ چند سپاہی ان کے سامنے بند توپیں تان کر کھڑے ہو گئے اور باقی بھوکے بھیڑوں کی طرح عورتوں پر ٹوٹ پڑے۔ کوئی کسی کا زیور اتار رہا تھا اور کوئی کسی کا لباس نوچ رہا تھا۔ عورتوں اور بچوں کی چیخیں کیسا تھ اگریزوں کے قبضے بلند ہو رہے تھے۔ صدیق علی یہ جھڑپ اس منظر پر داشت نہ کر سکا۔ وہ چھپٹ کر آگے بڑھا اور اپنے راستے کے ایک سپاہی کو دھکا دے کر گزرنے کے بعد آگے چھپنے کی دیر میں ایک انگریز افسر پرل پڑا جو ایک نوجوان لڑکی کو ہالوں کے کمرے پر کھینچوڑ رہا تھا اس نے ایک ہی

نشانہ آزما رہے تھے اور پھر جب فاتح لشکر انت پور کے قلعے پر اپنے پرچم کو سلامی دے رہا تھا تو چند زخمیوں اور بیماریوں کے سوا جنہیں انتہائی بے عزت سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ قلعے کے باقی محافظ اپنا سفر حیات ختم کر چکے تھے۔ وہ عورتیں جو بچ گئی تھیں۔ ان میں سے بہت کم ایسی تھیں جن کے چہروں پر زخموں کے نشان نہ تھے :

مجھ سے اسے نیچے گرا دیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اسے گلا دبوچ لیا۔ سپاہیوں نے بندوقوں کے کندھے مار مار کر اسے طعنے مارے اور اس کے ہاتھ ایک رسی سے جکڑ دیئے۔ اتنی دیر میں صدیق علی کے چند ساتھی بھی سپاہیوں کے ہاتھوں سے سنگین چھین کر چھ آدمیوں کو ہلاک کر چکے تھے۔ انگریزوں نے اس کے جواب میں قتل عام شروع کر دیا اور ان کی آن میں پچاس قیدی موت کے گھاٹ اتار دیئے۔ اس دشمنانہ قتل عام کے دوران میں کئی عورتیں اور لڑکیاں دشمن کی وحشت اور بربریت سے بچنے کے لیے قلعے کے کونوں میں چھلانگ لگا کر جانیں دے چکی تھیں۔

انگریز کمانڈنٹ نے صورتِ حالات پر قابو پاتے ہی بقیہ السیف قیدیوں میں سے بیس آدمی طعنے کیے اور ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر فیصل کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ صدیق علی ان کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہ رہا تھا۔ انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ دیوار سے چند قدم دور قیدیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ رضیہ چند عورتوں کے ساتھ پشت پر دیوار قیدیوں سے تھوڑی دور کھڑی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر وہیں تھی انگریز کمانڈنٹ نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور سپاہیوں نے اپنی بندوقیں سیٹی کر لیں۔

رضیہ اچانک عورتوں کے جھوم سے نکل کر بھاگی اور "صدیق صدیق" کہتی ہوئی بندوقوں کی زد میں آگئی۔ اس کے ساتھ کمانڈنٹ نے "فائر" کہہ کر ہاتھ نیچے کر دیا۔ بندوقوں کے مہیب دھماکوں کے ساتھ — ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ رضیہ، صدیق علی سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر گری — اٹھی — پھر گری — اور اس کے بعد زمین پر رینگتی ہوئی صدیق علی کی لاش سے لپٹ گئی۔

ایک انگریز افسر نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "یہ مر چکی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد انگریز سپاہی قیدیوں کی ایک اور ٹولی پر اپنی بندوقوں کا

چند ثانیے معظّم علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: "اگر میرے بیٹوں نے کسی میدان میں بیٹھ نہیں دکھائی تو میرے لیے ان کے متعلق کوئی ہتھیار بری نہیں ہو سکتی۔ بتائیے آپ کیا خبر لائے ہیں؟"

لطف علی نے کہا: "آپ اننت پور میں انگریزوں کے مظالم کے واقعات سن چکے ہیں؟"

"ہاں"

"صدیق علی خاں اننت پور کے قلعے کا محافظ تھا اور مسعود علی اس کے ساتھ تھا۔ اور وہ دونوں...؟"

"وہ دونوں شہید ہو چکے ہیں۔"

معظّم علی سکتے کے عالم میں چند ثانیے لطف علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "لیکن صدیق علی تو بھری فوج میں تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اننت پور کیسے پناہ لطف علی نے جواب دیا: "وہ منگلور سے سامان جنگ لے کر کنڈاپور گیا تھا۔ وہاں ایاز خاں کی غدار کی حالت پیدا ہوئے کہ اسے کنڈاپور کی فوج کی کمان سنبھالنی پڑی۔ اس کے بعد بٹور کے علاقے میں ہماری رہی سہی افواج اس کے گرد جمع ہو چکی تھیں مسعود علی پہلے سے وہاں تھا۔ وہ انگریزوں کے حملے سے چند دن پہلے اسد خاں کی کمان میں کنڈاپور پہنچ چکا تھا۔ اسد خاں کنڈاپور کی جنگ میں شہید ہوا۔ اس نے اپنی ذمہ داریاں صدیق علی کو سونپ دی تھیں۔ میں نے سنا ہے کہ اسد خاں آپ کا دوست تھا؟"

"جی ہاں وہ میرا بہترین دوست تھا۔"

سلطان معظّم کو صدیق علی اور مسعود کی شہادت کی خبر سن کر بہت صدمہ ہوا تھا اور

انہوں نے مجھے آپ کے نام ایک ذاتی خط دے کر بھیجا ہے۔ لطف علی نے ایک خط لکھا اور

معظّم علی کو پیش کر دیا۔

معظّم علی نے خط کھول کر پڑھا۔ سلطان ٹیپو نے لکھا تھا:۔

## اکیسواں باب

معظّم علی ایاز خاں کی غدار کی اور بٹور پر انگریزوں کے اچانک قبضے کی خبر سن چکا تھا۔ لیکن وہ صدیق اور مسعود کے انجام سے کئی دن بے خبر رہا۔ ایک صبح فرحت حسب معمول نماز سے فارغ ہو کر قرآن کی تلاوت کر رہی تھی اور معظّم علی مراد کے ساتھ فوجی درگاہ جلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ صابر نے اندر آ کر کہا: "ایک فوجی افسر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ملیبار سے کوئی اہم اطلاع لے کر آیا ہوں۔ میں نے اسے دیوان خانے میں بٹھا لیا ہے۔"

معظّم علی نے اپنے دل میں ناخوشگوار دھمکنیں محسوس کیں اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا دیوان خانے کی طرف بڑھا اور تھوڑی دیر بعد وہ میسور کی فوج کے ایک بڑے افسر کے ساتھ مصافحہ کر رہا تھا۔ معظّم علی نے کہا: "تشریف رکھیے۔ آپ ملیبار سے آئے ہیں؟"

"جی ہاں! میرا نام لطف علی بیگ ہے۔"

معظّم علی نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے کہا: "میں آپ کا نام سن چکا ہوں، فریڈی! لطف علی نے کہا: "مجھے سلطان معظّم نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔"

معظّم علی نے لطف علی کے چہرے پر اپنی نظی کا تے ہوئے کہا: "آپ صدیق اور مسعود یا انور میں سے کسی کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"جی میں صدیق اور مسعود کے متعلق بہت بری خبر لے کر آیا ہوں۔"

”میرے عزیز دوست! میں لطف علی کو ایک المناک خبر سنانے کے لیے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ کاش میرے الفاظ آپ کے زخموں کا مارا بن سکتے۔ میری سلطنت کے تمام خزانے صدیق علی اور مسعود جیسے جانا بڑا کے خون کے ایک قطرے کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ آپ نے کچھ حصہ قبل جنگ میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی تھی اور میں نے آپ کی درخواست کا اس لیے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ مجھے مجاز جنگ کی بجائے سرنگا پٹم کی فوجی تربیت گاہ میں آپ کی زیادہ ضرورت تھی۔ میری اب بھی یہی رائے ہے کہ آپ سرنگا پٹم میں زیادہ مفید کام کر رہے ہیں۔ تاہم اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو آپ جس وقت چاہیں سرنگا پٹم میں کسی موزوں آدمی کو اپنی ذمہ داریاں سونپ کر تشریف لے آئیں۔ مجھے جنگ میں بھی آپ جیسے لوگوں کے مشوروں کی ضرورت ہے۔“

خط پڑھنے کے بعد معظّم علی دیر تک گردن جھکائے سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے لطف علی کی طرف دیکھا اور کہا: ”آپ ان کی شہادت کے متعلق اچھی طرح تصدیق کر چکے ہیں؟“

”جی ہاں! اننت پور کے وحشیانہ قتل عام کے بعد انگریزوں نے چند عورتیں اور بچے جن میں سے اکثر زخمی تھے، ہمارے حوالے کر دیئے تھے اور انہوں نے آپ کے بیٹوں کی شہادت کی خبر کی تصدیق کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب اننت پور کے واقعات لوگوں کے سامنے آئیں گے تو میسور کا ہر باشندہ ان کی جرات، ہمت اور غیرت پر فخر کرے گا۔“

معظّم علی نے کہا: ”کاش ان کی قربانی اس قوم کی تقدیر بدل سکتی جس کی عزت اور آزادی چند غداروں اور ابن الوتوں کے رحم و کرم پر ہے۔ کاش میسور میں کوئی اور ایاز پیدا نہ ہو۔“

لطف علی نے کہا: ”مجھے اب اجازت دیجیے میں آج ہی واپس جانا چاہتا ہوں۔“

اگر آپ سلطان معظّم کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہیں تو میں پہنچا دوں گا۔“

آپ میری طرف سے سلطان معظّم کا شکریہ ادا کیجیے اور ان سے کہیے کہ میں بہت جلد ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“



ایک ہفتہ بعد رات کے پچھلے پہر معظّم علی اور فرحت مکان کے صحن میں کھڑے تھے معظّم علی سفر کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ مراد انکھیں ملتا ہوا برآمدے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: ”اباجان آپ تیار ہو گئے ہیں، ابھی تو بہت رات باقی ہے؟“

”نہیں بیٹا وہ دیکھ صبح کا ستارہ نمودار ہو چکا ہے۔“

مراد علی نے ماں کی طرف متوجہ ہو کر شکایت کے لہجے میں کہا: ”اتی جان آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جب اباجان اٹھیں گے آپ مجھے جگا دیں گی۔“

ماں نے جواب دیا: ”بیٹا میں نے تو یہ وعدہ کیا تھا کہ تمہارے اباجان تم سے مل کر جائیں گے۔“

معظّم علی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ”بیٹا تم وعدہ کرو کہ میری غیر حاضرگی میں اپنا دقت ضائع نہیں کر دو گے۔ صدیق اور مسعود ایک بہت بڑے مقصد پر قربان ہوئے ہیں اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے میسور کو بہترین آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں تمہیں میسور کا بہترین نوجوان دیکھنا چاہتا ہوں۔“

مراد علی نے پوچھا: ”اباجان آپ کب تک واپس آئیں گے؟“

”بیٹا میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ اور اگر انور علی مبارک چکھے تو اسے چند دن کے لیے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اس کے بعد معظّم علی فرحت کی طرف متوجہ ہوا۔ فرحت تعین پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں انشاء اللہ جلد واپس آ جاؤں گا۔“

فرحت نے منموہ لہجے میں جواب دیا: ”میں پریشان نہیں ہوں۔ میں یہ سوچ رہی تھی

کہ گذشتہ تیس برس میں ہمارے خاندانوں کی تین نسلیں یکے بعد دیگرے قوم کے غداروں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرتی چلی آ رہی ہیں۔ خدا معلوم اس ملک میں میر جعفر کی روح کب تک زندہ رہے گی اور یہ سلسلہ کہاں ختم ہوگا۔

معظم علی نے جواب دیا۔ "فرحت یہ دنیا خیر و شر کی رزمگاہ ہے مجھے یقین ہے، کہ ابن اوتوس، غداروں اور ملت فرشتوں کا یوم حساب اب قریب آچکا ہے۔ بڈنور کے واقعات نے سلطان ٹیپو کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ جنگ سے فارغ ہونے کے بعد ان کے سامنے پہلا مسئلہ قوم کو ان گندے عناصر کے وجود سے پاک کرنا ہوگا۔ انگریزوں سے نپٹنے کے بعد میں سلطان سے یہ مطالبہ کروں گا کہ بڈنور کے غداروں کا معاملہ میرے سپرد کر دیا جائے فرحت! جو قوم سلطان ٹیپو کو جنم دے سکتی ہے۔ اس کے لیے مایوس ہونے کی کوئی دنجی نہیں میں بہت جلد واپس آ کر تمہیں یہ خبر دے سکتا ہوں اور مسعود کا خون رانگلاں نہیں گیا اور انتہت پورا اور بڈنور پر ہماری فتح کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔"

فرحت کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ معظم علی چند ثانیے خاموش اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر خدا حافظ کہہ کر پل دیا۔ جب وہ صحن سے باہر نکل گیا تو فرحت مراد علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے مردانہ حقے کی طرف کھٹنے والے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے سے چند قوم آگے معظم علی گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا اور نوکر اس کے گرد جمع تھے۔ معظم علی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور فرحت کی آنکھوں سے آنسو بیٹھ نکلے

مراد علی کچھ دیر اپنی ماں کے ساتھ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "پلیے امی جان!"

ماں نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا: "چلو بیٹا اب مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔"



میسور کی افواج انگریزوں سے ساحلی چوکیاں چھیننے کے بعد حیدر گڑھ اور بڈنور کے ارد گرد کئی چھوٹے چھوٹے قلعوں پر قبضہ کر چکی تھیں اور بڈنور میں جنرل میتھیوز کی فوج سمندر کی طرف سے رسد و ملک کے تمام راستے بند ہو جانے کے باعث محاصرے کی سی حالت کا سامنا کر رہی تھی۔ سلطان ٹیپو حیدر گڑھ اور بڈنور کے درمیان ایک وادی میں پڑاؤ ڈالے مختلف محاذوں پر لڑنے والی افواج کی نگرانی کر رہا تھا۔

وہ جنگ کے ایام میں بھی سلطنت کے تمام حالات سے باخبر رہتا تھا۔ وزیر، صوبیدار اور دوسرے عہدیدار اسے باقاعدگی کے ساتھ اپنی کارگزاریوں کی تفصیلات لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ سلطان ہر روز اپنے عمال کے پیشوا خطوط، اور رعایا کی درخواستوں کے جواب اور اہم مقدمات کے فیصلے لکھواتا۔ ملاقاتیوں سے ملتا اور اس کے بعد فوجی معاملات کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتا۔ ایک دن گیارہ بجے کے قریب سلطان اپنے دفتری کاموں سے فارغ ہوا تو اس کے سامنے حسب معمول ملاقاتیوں کی فہرست پیش کی گئی۔ سلطان نے کاغذ پر نگاہ ڈالتے ہی پوچھا: معظم علی کب آئے ہیں؟

فہرست پیش کرنے والے افسر نے جواب دیا: "عالیجا! وہ کل رات یہاں پہنچے تھے۔ سلطان ٹیپو نے کہا: "انہیں لے آؤ۔"

افسر باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد معظم علی اندر داخل ہوا۔ سلطان نے مسند سے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اسے اپنے قریب ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا: "مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ ہم انتہت پرورد کے جانا بڑوں کو بروقت ملک نہ بھیج سکے۔ دشمن نے اچانک منگھور پر حملہ کر کے ہماری افواج کو اس محاذ سے توتہ ہٹانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اب ان قائلوں کا یوم حساب شروع ہو چکا ہے۔ ہم نے سمندر کی طرف سے دشمن کے سسڑے ملک کے راستے منقطع کر دیے ہیں۔ حیدر گڑھ فتح ہو چکا ہے اور کل دہاں سے ہماری فوج کا ایک حصہ انتہت پور روانہ ہو جائے گا اور اس کے بعد چند دن تک بڈنور کا قلعہ بھی ہماری

پتے یہاں پہنچ گئی تھی۔ مجھے ابھی سپہ سالار بننے پر بتایا تھا کہ آپ یہاں تشریف لائے ہیں  
اچی جان اور مرد کا کیا حال ہے؟

”وہ ٹھیک ہیں بیٹا۔ تمہارے سپہ سالار کہاں ہیں؟“  
”وہ اندر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ چلیے!“

معظم علی، انور علی کے ساتھ قلعے کے ایک کشتہ کرے میں داخل ہوا۔ مسیور کی فوج  
کا مایہ ناز جرنیل غازی خاں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اور اس کے سامنے کئی نقشے اور کاغذات  
بکھیرے ہوئے تھے۔ غازی خاں نے اٹھ کر معظم علی کے ساتھ گرم چوٹی سے مصافحہ کیا اور کہا  
”مجھے آپ کے متعلق حکم موصول ہو چکا ہے۔ آپ کی فوج علی الصبح کوچ کر کے یہاں  
تیار ہے۔“



اننت پور کے قلعے پر دو دن سے شدید گولہ باری ہو رہی تھی۔ انگریز قلعے سے باہر اپنی  
رمداد ملک کے راستے مسدد پا کر مایوس ہو چکے تھے۔ تیسرے دن معظم علی کی فوج قلعے پر  
فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑی تھی کہ قلعے کے ایک شکتہ برج پر سفید جھنڈا دکھائی دیا۔  
معظم علی نے فائرنگ بند کرنے کا حکم دیا اور فضا میں اچانک خاموشی چھا گئی۔ فوج کا ایک فوجوان  
افسر گھوڑا بھگانا ہوا معظم علی کے قریب پہنچا اور اس نے کہا ”جناب اس قلعے کی فوج کو امان  
دینا گناہ ہے ان لوگوں کے ہاتھ ہمارے بے گناہ بھائیوں اور بہنوں کے خون سے رنگے ہوئے  
ہیں۔ انھوں نے جنگی قیدیوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ ہم انھیں معاف نہیں کر سکتے۔“  
معظم علی نے جواب دیا ”ہم برائی میں اپنے دشمنوں کی تقلید نہیں کریں گے۔ صلح اور جنگ  
کے متعلق ہمارا اپنا ایک ضابطہ ہے۔“

”لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے بیٹوں کے ساتھ انھوں نے کیا سلوک کیا تھا؟“  
”مجھے معلوم ہے لیکن اپنے بیٹوں کی مظلومیت مجھے بیٹوں کی تقلید کرنے کی

تعمیر کی زور میں ہو گا۔ میرے الفاذا اس باپ کے دشمنوں کے لیے مرہم کا کام نہیں دے سکتے جو  
صدیق علی اور مسعود علی جیسے ہونہار بیٹوں سے محروم ہو چکا ہے۔ لیکن میں آپ کو یہ یقین دلا  
سکتا ہوں کہ اننت پور کے شہیدوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی  
معظم علی نے کہا ”ایک باپ کے لیے اس سے زیادہ حوصلہ افزا خبر کیا ہو سکتی ہے، کہ  
اس کے بیٹے آپ کی نگاہوں میں عزت کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔“  
سلطان نے کہا ”آپ جنگ میں حصہ لینے پر مصرعے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ  
کو اننت پور پر حملہ کرنے والی فوج کی کمان سونپنے کے لیے تیار ہوں۔“  
معظم علی نے جواب دیا ”عالیجاہ! اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو میں شکر کے  
ساتھ یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔“

سلطان بیٹھنے لگا۔ ”جب آپ اس ہم سے واپس آئیں گے تو میں آپ کو اس  
سے زیادہ اہم ذمہ داری سونپنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے بڑھو کی صوبیداری کے لیے آپ سے  
زیادہ موزوں اور کوئی نظر نہیں آتا۔ آپ حیدر گڑھ جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ شام سے پہلے  
وہاں کے سپہ سالار کے نام آپ کی تقرری کے احکام پہنچ جائیں گے۔“  
معظم علی نے احسان مندی کے ساتھ شیر مسیور کی طرف دیکھا اور اٹھ کر نیچے سے باہر  
نکل آیا۔

عزوب آفتاب سے تھوڑی دیر قبل معظم علی گھوڑا دوڑانا ہوا حیدر گڑھ کے قلعے کے دروازے  
پر کھڑا تھا۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ گھوڑے سے اترتے  
وقت معظم علی کی نگاہیں ایک فوجوان کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ یہ اس کا تیسرا بیٹا انور علی  
تھا۔ اس کے جوتوں پر ایک مغموم مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ چند  
ٹائینے معظم علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے کہا ”انور تم کب سے یہاں ہو؟“  
اور کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس نے جواب دیا ”ابا جان ہماری۔“

قلعے کا دروازہ کھلا اور ایک انگریز افسر جس کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا، گھوڑا دوڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ معظم علی سے کہہ رہا تھا: "ہمارے کمانڈر مارکر جنگ کے لیے آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔"

عظم علی نے جواب دیا: "انھیں ہمارے ساتھ بات کرنے کی ضرورت نہیں تم ان سے کہو کہ جنگ ختم کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ ہتھیار ڈال دیں!" انگریز افسر نے کہا: "اگر آپ ہمیں اپنی حالت میں مدد شیوگر ٹھہر پیمانے کا ذمہ لیں تو ہم یہ قلعہ خالی کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

عظم علی نے تلخ ہو کر جواب دیا: "تم ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو۔ جنگ بند کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ تم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دو۔"

انگریز افسر نے قدرے تذبذب کے بعد کہا: "اگر ہم غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ ہمارے ساتھ جنگی قیدیوں کا سا سلوک کریں گے؟" ہم تمہیں کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔ تمہارے جلائم ایسے ہیں کہ تمہارے ساتھ

بات کرنا بھی انسانیت کی توہین ہے لیکن تم اپنے کمانڈر کو میری طرف سے یہ بتا سکتے ہو کہ ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک کریں گے جو تم نے اننت پور کا قلعہ فتح کرنے کے بعد ہمارے سپاہیوں اور ہماری عورتوں کے ساتھ کیا تھا۔ میں تمہیں فیصلہ کرنے کے لیے نصف گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد قلعے پر گولہ باری شروع کر دی جائے گی۔ تم جا سکتے ہو۔"

انگریز افسر نے کہا: "اگر آدھ گھنٹے کے بعد قلعے کا دروازہ کھول دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے آپ کا فیصلہ تسلیم کر لیا ہے۔"

عظم علی نے جواب دیا: "نہیں یہ کافی نہیں۔ آپ کو تمام فوج قلعے سے باہر پھری کرنی پڑے گی اور ان کے ہتھیار ایک جگہ ڈھیر کرنے ہوں گے۔ پھر جب ہر قلعے پر قبضہ

کریں گے تو آپ کو کسی موزوں جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔"

انگریز افسر نے معظم علی کو فوجی سلام کرنے کے بعد گھوڑے کی باگ موڑ لی۔ کوئی بیس منٹ بعد قلعے کا دروازہ کھل چکا تھا اور انگریز باہر نکل کر نصیب سے چند گز آگے اپنا اسلحہ ڈھیر کر رہے تھے۔

عظم علی نے قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد انگریز عورتوں کو چند گھنٹوں میں بند کر دیا۔ قلعے کے اندر میسرور کی فوج کے وہ قیدی جو انگریزوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گئے تھے، ہڈیوں کے ڈھانچے معلوم ہوتے تھے اور چلا چلا کر صید علی اور اس کے ساتھیوں کے انتقام کا مطالبہ کر رہے تھے۔

عظم علی نے انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ میں صید علی اور مسعود کا باپ ہوں جب معظم علی نے شہداء کی قبروں کے متعلق پوچھا تو ایک قیدی نے بتایا کہ ان سب کو قلعے سے باہر ایک ہی گڑھے میں دفن کر دیا گیا تھا اور وہ گڑھا ہم سے کھدوایا گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فاتح لشکر قلعے سے باہر مٹی کے ایک انبار کے گرد کھڑا تھا اور اس انبار کے اوپر میسرور کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ معظم علی قیدیوں کی زبانی اس لڑکی کے متعلق سن رہا تھا۔ جس نے صید علی کے ساتھ جام شہادت نوش کیا تھا کسی کو اس کی پوری داستان معلوم نہ تھی۔ اپنے ان گنت سوالات کے جواب میں وہ صرف یہ معلوم کر سکا کہ اس کا بیٹا کسی عالی نسب اور بے یار و مددگار لڑکی کا آخری سہارا تھا اور اس نے اسے شیوگر کے قلعے سے اپنے گھر بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔

عظم علی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور صید علی اور مسعود کے بچپن اور جوانی کی بے شمار تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ پھر اپنے بیٹوں کے ساتھ وہ ایک لڑکی کی مختلف خیالی تصویریں دیکھنے لگا۔ "میری بیٹی! وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تو کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی؟ میں

اپنے اپنے مورچوں سے نکلے اور دیکھتے ہوئے شہر پناہ کی طرف بڑھنے لگے۔ پھر کئی نوجوان اچانک بانس کی سیڑھیاں اٹھا کر بھاگے اور ان کی آن میں نصیل کے قریب پہنچ گئے لیکن دشمن کی شدید مزاحمت کے باعث وہ نصیل کے کسی حصے پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہوئے اور انھیں مشرقی دروازے کے آس پاس چند لاشیں چھوڑ کر پھرتے ہوئے پڑا۔ معظم علی نصیل سے کوئی تیس چالیس قدم دور ایک زخمی سپاہی کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ دو فرانسیسی جوان جن میں سے ایک کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل تھی اور دوسرا اپنے بازوؤں میں ایک بارودی گولہ تھامے ہوئے تھا۔ بے تماشاً نصیل کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے فرانسیسی سپاہیوں کا ایک دستہ نصیل کے مورچوں پر گولیاں برساتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ معظم علی بلند آواز میں چلایا۔ دشمن کو اپنی طرف متوجہ رکھو! اور اس کے ساتھیوں نے پلٹ کر نصیل پر گولیاں برساتی شروع کر دیں۔ غازی خاں اور فوج کے دوسرے افراد سمجھ کر فرانسیسی جاننازدوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بارودی گولے کے بوجھ کے باعث فرانسیسی سپاہی اپنی دوڑ کا آخری مرحلہ پڑی شکل سے طے کر رہا تھا اور دوسرا جس کے ہاتھ میں مشعل تھی، چند قدم بھاگ کر اپنے ساتھی سے آگے نکل جاتا اور پھر اچانک زمین پر لیٹ کر اس کا انتظار کرتا۔ نصیل سے آٹھ دس قدم دور دو دنوں کے بعد دیگر سے زخمی ہو کر گر پڑے ایک تانبہ بعد ان میں سے ایک دوبارہ اٹھا اور گولہ اٹھا کر نصیل کے ساتھ جاگرا۔ پھر اس نے گولے کو نصیل کے تنگات کے اندر دھکیل دیا اور زمین پر ریٹکتا ہوا واپس مڑا۔ اپنے گولے ہوئے ساتھی کے قریب پہنچ کر اس نے جلتی ہوئی مشعل اٹھائی اور دوبارہ مڑ کر نصیل کی طرف دیکھنے لگا لیکن اچانک اس کے سر پر گولی لگی اور وہ بے حس و حرکت لیٹ گیا۔ معظم علی اچانک اٹھ کر پوری رفتار سے بھاگا اور پھر اچانک زمین پر منہ کے بل لیٹ گیا۔ پھر چند قدم اٹھا کر بھاگا اور دوبارہ لیٹ گیا۔ تیسری کوشش میں وہ فرانسیسی

سبب کسی نہیں دیکھوں گا لیکن اگر تھاری روح میری آواز سن سکتی ہے تو میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے بچوں سے کم عزیز نہیں ہو۔



اگلے دن معظم علی نے چار سو سپاہی قلعے کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر باقی دستوں کے ساتھ سلطان کے پڑاؤ کا رخ کیا۔ راستے میں اسے یہ اطلاع ملی کہ سلطان کا لشکر بڑوں کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ معظم علی اپنی پیادہ فوج کو پیچھے چھوڑ کر سوار دستوں کے ہمراہ بھاگتا ہوا پڑاؤ پہنچا تو وہاں لڑائی شروع ہو چکی تھی۔

معظم علی نے شہر کی مشرقی دیوار سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر اپنے ساتھیوں کو رکھنے کا حکم دیا اور وہ گھوڑے سے اتر کر بھاگتا ہوا ایک ٹیلے پر چڑھا۔ اس نے آنکھوں سے دور بین لگا کر صورتِ حالات کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹیلے سے اتر آیا اور اپنے ساتھیوں کو گھوڑوں سے اترنے کا حکم دے کر ایک انفر کی طرف متوجہ ہوا۔ تم اپنے سپاہیوں سے کہو کہ وہ گھوڑوں کو پیچھے لے جائیں، میں باقی دستوں کے ساتھ آگے جا رہا ہوں۔

چند منٹ بعد وہ شہر کی مشرقی سمت غازی خاں کی قیادت میں لڑنے والے سپاہیوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ سلطان کی فوج کا فرانسیسی نونچانہ نصیل کے مشرقی دروازے پر گولہ باری کر رہا تھا اور تو نچانے کے دائیں بائیں غازی خاں کی فوج فیصد کن حملے کے لیے حکم کا انتظار کر رہی تھی۔ فرانسیسی تو نچانے کی گولہ باری کے باعث مشرقی دیوار میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے تنگات پیدا ہو چکے تھے۔ تاہم انگریز نصیل کے مورچوں پر ڈٹے ہوئے تھے اور ان کی جوانی گولہ باری کا کافی شدید تھی۔ شہر کی معنویت سے نفاذ کی صلاحیت یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ اس طرف نام حملے کا حکم ہو چکا ہے۔ غازی خاں نے نفاذ کی صلاحیتیں سننے ہی اپنے دستوں کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ سپاہی



سپاہی کے ہاتھ سے گری ہوئی مشعل اٹھا چکا تھا۔ پھر کیے بعد دگر سے اس کی دان  
ادراس کے سینے میں دو گولیاں لگیں لیکن وہ گرتے پڑتے باردی گولے کے قریب پہنچ  
چکا تھا۔ فصیل کے شکاف کے اندر سمٹنے کے بعد وہ ادھر سے آنے والی گولیوں کی زد سے  
محفوظ تھا۔ اس نے جلتی ہوئی مشعل باردی گولے کے فیتے پر رکھ دی پھر اپنی رہی ہے  
وقت بروئے کار لاتے ہوئے فصیل کے شکاف سے باہر نکلا اور بھاگنے لگا۔  
اتنی دیر میں فصیل کے مورچوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ فصیل سے بیس گز دور معظلی  
گھر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زبردست دھماکا سنا دیا۔ دھوئیں ادا گرد کے بادل  
اڑے اور مسور کے سپاہی قلعے کی مشرقی دیوار میں ایک چھوٹے شکاف کی جگہ ایک بڑی  
گذرگاہ دکھ رہے تھے۔



معظلی نے ہوش میں آ کر اکھیں کھولیں تو وہ ایک نیچے کے اندر لیٹا ہوا تھا۔ انور علی  
در مسور کی فرج کا ایک بہترین طبیب اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے گھر آ کر  
اسٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت کے باعث اس کی اکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ طبیب نے  
جلدی سے اسے سہارا دے کر لٹاتے ہوئے کہا: "آپ آرام سے لیٹے رہیں!"  
معظلی نے چند تینے سستانے کے بعد انور علی کی طرف دیکھا اور کہا: "میں کہاں ہوں  
بڑو فرخ بوا یا نہیں؟"

اباجان! بڑو فرخ کا شہر فتح ہو چکا ہے۔ اب صرف قلعہ باقی ہے۔

معظلی نے کہا: "بیٹا! تمہیں میری خاطر اپنے زانوں سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔"  
"اباجان مجھے سلطان معظم اور غازی خاں نے آپ کے پاس ٹھہرانے کا حکم دیا تھا۔  
ابھی آپ کو دیکھ کر گئے ہیں۔ برہان الدین بھی آپ کو دیکھنے آئے تھے۔ ابھی قلعہ پر حملہ شروع  
نہیں ہوا۔ اس کے گرد ابھی تو میں نصب کی جا رہی ہیں۔"

معظلی نے درد سے کراہتے ہوئے کہا: "بیٹا شہر کی لڑائی میں مہاراز زیادہ نقصان  
تو نہیں ہوا؟"  
"نہیں اباجان! شہر کی فصیل ٹوٹنے کے بعد انگریز چادروں اطراف سے بیٹھوں کی  
قلعے کی طرف دوڑ رہے تھے۔"

طبیب نے دوا کی پیالی معظلی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "ہاتھ کرنے  
سے آپ کی تکلیف میں اضافہ ہوگا۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ یہ دوا پی لیجیے!"  
معظلی نے جواب دیا: "اگر یہ دوا مجھے یہ ہوش کرنے کے لیے ہے تو میں نہیں  
پیوں گا۔ میں اپنی زندگی کی باقی گھڑیوں میں سے ایک لمحہ کے لیے بھی ہوش رہنا پسند  
نہیں کروں گا اور آپ اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ میں صرف چند گھڑی کا ہمان ہوں  
انور علی نے کہا: "اباجان! غازی خاں کہتے تھے کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو امی جان  
اور مراد علی کو یہاں لانے کا انتظام ہو سکتا ہے؟"

معظلی نے جواب دیا: "نہیں بیٹا! تم جاؤ اور کہیں سے کاغذ اور قلم لے آؤ۔  
میں ان کے نام ایک خط لکھنا چاہتا ہوں۔"  
انور علی اٹھ کر باہر نکل گیا اور طبیب نے کہا: "دیکھیے آپ اس حالت میں  
خط نہیں لکھ سکتے۔"

"آپ کو مجھے اپنی زندگی کا آخری فرض ادا کرنے سے منع نہیں کرنا چاہیے۔ میں  
خود کہنے کی بجائے انور علی یا آپ میں سے کسی کو چند سطریں لکھوا دوں گا۔"  
طبیب نے کہا: "میں آپ کو کسی بات سے منع نہیں کر سکتا لیکن آپ کہہ دوں  
کی تقویت کے لیے یہ دوا ضرور پی لیں۔"

معظلی نے جواب دیا: "فتح کی خبر سے زیادہ میرے دل کے لیے اور کونسی چیز تقویت  
کا باعث ہو سکتی ہے۔ بہر حال میں دوا پی لیتا ہوں۔"

طیب نے ایک بوتل سے چند گھونٹ دوا نکال کر پیالی میں ڈالی اور معظم علی کو پلا دی۔

اور علی قلمدان اور کاغذ اٹھائے خیمے میں داخل ہوا اور اپنے باپ کے بستر کے قریب بیٹھ گیا طیب نے معظم علی سے کہا: "آپ اطمینان سے خط لکھو میں۔ میں باہر انتظار کرتا ہوں۔" پھر وہ اور علی کی طرف متوجہ ہوا: "اگر ضرورت پڑے تو مجھے آواز دے دینا!" طیب باہر نکل گیا اور معظم علی فرحت کے نام خط لکھوانے میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب یہ طویل خط ختم ہو چکا تھا تو معظم علی اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا: "بیٹا! یہ خط اپنی ماں کو دے دینا۔ میں تمہیں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ میرے بعد تم پر اپنی والدہ، اپنے بھائی اور سب سے زیادہ اپنے ملک و قوم کے متعلق کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک سعادت مند بیٹے اور ایک متقی بھائی ثابت ہو گے لیکن میری امیدیں اور آرزوئیں اس سے بہت زیادہ ہیں۔ تمہارے لیے اور تمہارے بھائیوں کے لیے میری دعائیں ہمیشہ یہ رہی ہیں کہ تم قوم کی عزت اور آزادی کے امین بنو اور تمہاری آئندہ نسلیں اس درخت کی شاخوں پر چھو لے ڈالیں جسے تمہارے اسلاف کے خون نے آبیاریا ہے۔ میسور ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری حصا ہے۔ سلطان ٹیپو کی فتح ان کردڑوں انسانوں کی فتح ہوگی جو اس ملک میں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ تمہارے متعلق میری آخری خواہش یہ ہے کہ جب میسور کی عورت اور آزادی کے محافظ فتح و نصرت کے پرچم لہرائیں تو تم فخر کے ساتھ سرا دینا کہ یہ کہہ سکو کہ میسور کی خاک پر میرے باپ اور میرے بھائیوں کا خون گرا تھا۔ تم کسی دن میری قبر پڑاؤ اور مجھے یہ مزوہ سناؤ کہ اباجان آپ نے جس عظیم مقصد کے لیے قربانیاں دی تھیں وہ پورا ہو چکا ہے۔ آزادی کے جس سورج کی تلاش میں آپ مرشد آباد سے نکلے تھے وہ میسور میں پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے۔"

بیٹا! تمہاری منزل بہت دور اور تمہارا راستہ بہت کٹھن ہے لیکن قدرت نے تمہیں ایک ایسا رہنما عطا کیا ہے جو عزم و ثبات اور ایثار و غلوص کی نعمتوں سے مالا مال ہے۔ ایک قافلے کی اس سے زیادہ اور کیا خوش بختی ہو سکتی ہے کہ اس کا رہنما ہیبت تاریکیوں، اندھیوں اور طوفانوں میں اپنی منزل دکھانے والا ہو؟

اور علی بڑی شکل سے اپنے افسوسناک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کہا: "اباجان مجھے یقین ہے کہ آپ تندرست ہو جائیں گے۔ سلطان کو آپ جیسے ساتھیوں کی ضرورت ہے اور میسور میں ابھی آپ کے حصے کا بہت سا کام باقی ہے!"

معلم علی نے کہا: "بیٹا! شاہراہ زندگی کے ہر مسافر کی ایک آخری منزل ہوتی ہے اور میں اپنی زندگی کے آخری سانس کے لیے اس سے بہتر مقام کی تمنا نہیں کر سکتا تھا۔ تمہاری عمر میں میری سب سے بڑی خواہش یہ ہو کر نہ تھی کہ میں حق کے لیے زندہ رہوں حق کے لیے لڑوں اور حق کے لیے جان دوں!"

طیب خیمے میں داخل ہوا اور اس نے معظم علی کے قریب بیٹھ کر اس کی نبض دیکھتے ہوئے کہا: "آپ کے چند دوست آپ کو دیکھنے آ رہے ہیں لیکن میں آپ کو اب زیادہ دیر باتیں کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ آپ اپنے زخموں میں زیادہ درد محسوس تو نہیں کرتے؟ معظم علی نے سرکلنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا: "نہیں! باتیں کرتے وقت مجھے درد کا احساس نہیں رہتا۔"

غازی خان، برہان الدین اور فوج کے تین اور بڑے افسر خیمے کے اندر داخل ہوئے۔ غازی خان نے آگے بڑھ کر معظم علی کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "آپ کیسے ہیں؟"

معلم علی نے جواب دیا: "میں ٹھیک ہوں۔ قلعہ فتح ہو چکا ہے؟"

غازی خان نے جواب دیا: "نہیں! قلعے کی فتح کی خبر سننے کے لیے آپ کو شاید

وہ بہت مصروف ہیں۔

الغرض علی نے کہا: "اباجان! اگر آپ چاہیں تو میں غازی خاں کی وساطت سے ان تک آپ کا پیغام پہنچا سکتا ہوں۔ سلطان معظم عشر کی نماز کے بعد آپ کو دیکھنے سے تھے لیکن اس وقت آپ ہیروش تھے۔"

معظم علی نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا: "انہیں اس وقت تکلیف دینے کی ضرورت نہیں اور بیٹا تم بھی لیٹ جاؤ۔"

انور علی نے کہا: "اباجان! طبیب کسی زخمی کو دیکھنے کے لیے گیا ہے جب وہ واپس آئے گا تو میں سو جاؤں گا۔ آپ میری فخر کریں۔"

رات کے پچھلے پہر طبیب اسے دوا پلا رہا تھا اور انور علی اس کے قریب بیٹھا اور نگہ رہا تھا۔ خیمے سے باہر فہموں کی چاب ستائی دی۔ پھر کوئی یہ کہتا ہوا ستائی دیا: "تم یہیں ٹھہرو" اور ایک تانبہ بعد انسانی سلطوت و جبروت کا ایک پیکر مجسم خیمے کے اندر داخل ہوا۔ معظم علی نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی نگاہیں سلطان ٹیپو کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ طبیب ادب سے سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ انور علی نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور جلدی سے اٹھ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ معظم علی نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی۔ سلطان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اپنے ہاتھوں کا سہارا دیا اور کہا: "آپ اطمینان سے لیٹے رہیں۔ پھر وہ بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔"

معظم علی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: "عالیجاہ! مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور تشریف لائیں گے۔ اگرچہ ایسی خواہش آپ کے ایک خادم کو زیب نہیں دیتی۔ سلطان نے کہا: "آپ میرے درست ہیں اور مجھے آپ کی دوستی پر فخر ہے۔ معظم علی نے کہا: "آپ ان لوگوں سے خبردار رہیں جو قوم کی عزت اور آزادی

چند دن انتظار کرنا پڑے۔ اس وقت اہم مقامات پر توپیں نصب کی جا رہی ہیں اور شام تک گولہ باری شروع ہو جائے گی۔ سلطان معظم آپ کے متعلق بہت فخر مند ہیں اور انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ اگر آپ پسند کریں تو آپ کے بچوں کو یہاں بلا لیا جائے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "نہیں! میں اس حالت میں انہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

معظم علی سے چند منٹ اور باتیں کرنے کے بعد غازی خاں اور اس کے ساتھی خیمے سے باہر نکل گئے۔ برہان الدین نے خیمے سے باہر نکلنے وقت مڑ کر دیکھا اور طبیب کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ طبیب جلدی سے خیمے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ برہان الدین اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے آیا اور بولا: "سلطان معظم کا حکم ہے کہ آپ ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے نا؟"

طبیب نے سر ہلاتے ہوئے کہا: "نہیں! ان کا اس وقت تک اطمینان سے باتیں کرنا بھی ایک معجزہ ہے۔ زخم بہت شدید ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ ان کی ہمت اچانک جواب دے جائے گی۔"

برہان الدین نے کہا: "ان کی جان بہت قیمتی ہے۔"

طبیب نے کہا: "آپ اطمینان رکھیں، میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔"

اگلی رات معظم علی کی حالت بہت نازک ہو چکی تھی وہ کبھی کبھی ہوش میں آ کر انور علی سے کوئی بات کرتا لیکن چند منٹ کے بعد اس کی طاقت جواب دے جاتی اور وہ نیم ہو کر کی حالت میں آنکھیں بند کر لیتا۔ آدھی رات کے قریب اس نے انور علی سے کہا: "بیٹا! میرا خیال تھا کہ میں آخری سانس لینے سے پہلے سلطان معظم سے چند باتیں کر سکوں گا لیکن

کو تجارت کا مال سمجھتے ہیں۔ ایک غدار ہزاروں شہیدوں کی قربانی پر پانی پھیر سکتا ہے۔ خدا معلوم اس ملک میں ابھی کتنے ایاز ہیں۔ بڑا دراصلیہار کے باقی علاقوں سے دشمن کو تکلنے کے بعد آپ کسی غدار کو زندہ زچھوڑیں!

سلطان نے جواب دیا۔ "غدار اپنا وار کرنے سے پہلے ہمارے سامنے نہیں آتے۔ اچھے ختم کرنے کے لیے ایک حکمران کی بصیرت سے زیادہ پوری قوم کے اجتماعی احساس کی بیداری کی ضرورت ہے۔ خطرناک ناسوداں جسم پر ظاہر ہوتے ہیں جس میں صالح خون کی جگہ فاسد مادہ جمع ہو چکا ہو۔ غدار ہمیشہ اس قوم کی آغوش میں جنم لیتے ہیں جس کی قوت بحال کر دوڑ ہو چکی ہو۔ میری پونجی وہ تہی دست قوم ہے جس کی عزت اور حریت کے خزانے لٹ چکے ہیں۔ اس قوم میں زندگی کی نئی روح بیدار کرنے کے لیے مجھے وقت کی ضرورت ہے۔ اگر خدا نے مجھے ان جنگوں سے فرصت دی تو شاید میں یہ کام بھی کر سکوں لیکن میری جنگ مرمت انگریزوں کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ مرہٹے اور نظام بھی مجھے اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔"

مظلم علی نے نقاہت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ قدرت نے آپ کو جس مقصد کے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ ضرور پورا ہوگا۔"

سلطان نے طبیب کی طرف دیکھا اور وہ جدی سے آگے بڑھ کر مظلم علی کی بخش ٹھونے لگا۔ سلطان نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ مظلم علی! مظلم علی نے آنکھیں کھولیں اور سلطان کا ہاتھ بڑھ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور کہا۔ "عالیجاہ! مجھے موت کے لیے اس گھڑی کا انتظار تھا۔ خدا آپ کو فتح دے" پھر محبت اطاعت اور عقیدت سے لہریز لگا بہیں سلطان شیو کے چہرے پر موزہ ہو گئیں۔ چند ثانیے بعد مظلم علی نے ایک گہری اور لمبی سانس لی اور سلطان کے ہاتھ پر اپنی

گرت ڈھیلی چھوڑ دی۔ مرشد آباد کی تاریک رات کا مسافر میسور کی حسین صبح کے آفتاب کے سامنے دم توڑ چکا تھا۔ طبیب سلطان کا اشارہ پا کر آگے بڑھا۔ اس نے مظلم علی کی نبض دیکھی اور سر ہلا دیا۔

سلطان "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہہ کر اٹھا۔ انور علی بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ سلطان نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ بیٹا! ان کی زندگی قابلِ تقلید اور ان کی موت قابلِ رشک تھی۔"



چند دن بعد سہ پہر کے وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ فرحت اور مراد علی مکان کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے اچانک مراد علی چلایا۔ "امی جان! امی جان!! صبا امی جان آگئے!" پھر وہ اٹھ کر بھاگتا ہوا صحن کی طرف بڑھا اور انور علی سے لپٹ گیا۔ انور علی کا لباس پانی اور کچھ پتے سے لپٹا تھا اور مراد علی کو اپنے ساتھ چمٹائے آگے بڑھا۔ فرحت اپنی نگاہوں میں ہزاروں دعائیں لیے اٹھی اور برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب کھڑی ہو گئی لیکن انور علی کے چہرے پر حزن و دلال کے آثار دیکھ کر اس کا دل مٹیٹھ گیا۔ انور علی نے برآمدے کی سیڑھیوں پر پانچ رکھتے ہوئے مرجھائی ہوئی آواز میں سلام کیا اور پھر آگے بڑھ کر ماں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" ماں نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ تم بہت پریشان نظر آتے ہو!"

چند لمحات کے لیے انور علی کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ پھر اس نے اچانک جھک کر مراد علی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "امی جان! ابا جان شہید ہو چکے ہیں۔"

فرحت کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑی رہی اور پھر لاکھڑی ہوئی دیوار کی طرف

ہو اور میں تمہیں دوبارہ دیکھ سکوں لیکن اب مجھے زندہ رہنے کی خواہش  
بھی ایک خود فریبی معلوم ہوتی ہے۔ میرے زخم بہت شدید ہیں اور  
اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تمہارے نام پر خط میرا آخری  
پیغام ہو۔

میں نے اپنی زندگی کے بہترین ایام تمہاری رفاقت اور تمہاری  
رفاقت سے پہلے تمہاری یادیں گزاسے ہیں۔ میری امیدوں، آرزوؤں  
انگلوں اور دلوں نے ان پسوں کے ساتھ جنم لیا تھا جو میں تمہارے  
مستحق دیکھا کرتا تھا۔ تمہاری رفاقت نے میری زندگی کو اعلیٰ و ارفع مقام  
عطا کیے۔ مجھے تمہارے بچوں کے لیے ایک ایسے وطن کی تلاش تھی جہاں  
وہ عزت اور آزادی کی زندگی بسر کر سکیں اور مسعد میرے خوابوں کی جنت  
ہے۔ ایک بڑی آرزو کی تکمیل کے لیے عظیم قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ میرا وہ  
میرے بیٹوں کا خون میسرور کے ان گنت مجاہدوں کے خون سے زیادہ  
قیمتی نہیں جو قوم کی عزت اور ناموس پر قربان ہو چکے ہیں۔ میں نے اشدت  
میں مٹی کا وہ انبار دیکھا تھا جس میں صدیق اور مسعود کے ساتھ سیکڑوں  
اور شہیدوں کی لاشیں دفن تھیں۔ کتنے دلدین، کتنی بہنیں اور بھائی، کتنے  
بچے اور بیویاں انتہت پورے کوسوں دردن کا انتظار کر رہے ہوں گے اور  
آنے والے دور میں مذموم اشدت پور کی داستان میسرور کے کتنے قلعوں،  
کتنے شہروں اور کتنی بستیوں میں دہرائی جائے گی۔

سلطان ٹیپان مجاہدوں کے قائد ہیں جنہیں قدرت نے ایک  
ذوال پذیر قوم کے ماسی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے منتخب کیا  
ہے۔ میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ سلطان کی جدوجہد کا آخری انجام کیا ہوگا۔

بڑھی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کی خاموشی چیخوں سے زیادہ دردناک اور اس کی ہلکی ہلکی  
آنسوؤں سے زیادہ کرب انگیز تھیں۔ اور علی آگے بڑھ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے  
اپنی کر کے تھیلے سے معظ علی کا خط نکال کر مال کو پیش کرتے ہوئے کہا: "امی جان  
زخمی ہونے کے بعد آبا جان نے آپ کے لیے یہ خط لکھوایا تھا۔"

زحمت نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے خط پکڑ لیا لیکن کھول کر پڑھنے کی بجائے اسی  
طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ مراد علی نے آگے بڑھ کر کہا: "امی جان! آپ نے  
آبا جان کا خط نہیں پڑھا؟"

زحمت کے ہونٹ پکپکاتے اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آنسو اتر گئے۔ پھر  
اچانک اس نے مراد علی کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب  
چھوٹ نکلا۔

صابر۔ اور علی اور علی کہتا ہوا صحن میں داخل ہوا لیکن برآمدے کے قریب پہنچ  
کر ایک غیر متوقع صورت حالات کا سامنا کرنے کے بعد ٹھٹھک کر رہ گیا۔ کیا ہوا بی بی جی؟  
اس نے سہمی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

زحمت جواب دینے کی بجائے اٹھی اور کمرے کے اندر چلی گئی۔ مراد علی اٹھ کر آگے  
بڑھا اور صابر کے ساتھ چٹ کر سسکیاں لینے لگا۔ اور علی نے کہا: "چچا صابر! آبا جان  
شہید ہو گئے ہیں۔"

صابر کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا اور پھر چھوٹ چھوٹ کر رونے لگا۔  
زحمت کمرے میں جا کر ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں  
سے اپنے شوہر کا خط کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ معظ علی نے لکھا تھا:

"رفیق حیات! میں زخموں سے نڈھال ہوں اور بستری پر لیٹ ہوا  
تمہیں یہ خط لکھوا رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ قدرت کو میرا زندہ رہنا منظور

کو شکست ہوئی ہے تو اس کے سپاہیوں کا خون رائگاں جاتا ہے  
لیکن اب یہ حقیقت میرا جزو ایمان بن چکی ہے کہ جو مجاہد فتح و  
شکست سے بے پروا ہو کر کسی ارضِ داعیٰ مقصد کے لیے جان  
دیتے ہیں۔ ان کی قربانیاں کبھی رائگاں نہیں جاتیں اور وہ مقاصد  
جن کے لیے یہ بے لوث قربانیاں دی جاتی ہیں۔ انسانیت کی  
قیمتی میراث بن کر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ جب حق و صداقت کے  
علمداروں کا ایک قافلہ گزرتا ہے تو قدرت اس کے پرچم اٹھانے  
کے لیے کسی اور قافلے کو بھیج دیتی ہے۔ میں جب اپنی قوم کے  
ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت  
کا جھنڈا سلطان ٹیپو نے اٹھایا ہے، اسے گذشتہ صدیوں میں کئی  
اولوالعزم انسان بلند کر چکے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے تھے جن  
کی لیکار پر لیبیک کہنے کے لیے زندہ اور باحیثیت اقام موجود تھیں  
اور ان کے مقدر میں کامیابیاں اور کامراناں تھیں۔ لیکن ایسے  
بھی تھے جو اپنی اولوالعزمی اور غیر معمولی جرأت اور ہمت کے باوجود  
منضوب اقوام کو راہِ راست پر نہ لاسکے اور جن مٹھی بھر مرزوشوں  
نے ان کی آواز پر لیبیک کہا ان کا مقدس خون قوم کی تاریخ کے روشن  
صفحات لکھنے کے کام نہ آسکا۔ جب میں مستقبل کے متعلق سوچتا  
ہوں تو بھی میرا ضمیر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہمارا پرچم  
کبھی سرنگوں نہیں ہوگا۔ اس ملک کے کسی نہ کسی گوشے سے کوئی نہ  
کوئی اولوالعزم انسان اسے سہارا دیتا رہے گا اور پھر ایک دن ایسا  
آئے گا جب پوری قوم منظم اور متحد ہو کر اس جھنڈے تلے جمع ہو

— آگ اور خون کے کتے طوفان میں جوان کی منزل کے راستے میں  
جامل ہیں — بیدنی حملہ آوروں کے علاوہ ملک کے اندر کتے ہی تو  
کتے ضمیر زوش، منافق اور غدار ایسے ہیں جو قوم کے اس بطل جلیل کو  
اپنے راستے کا کاٹنا سمجھیں گے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر جنوبی  
ہندوستان کے مسلمانوں نے خودکشی کا ارادہ نہیں کر لیا تو میسوران کی  
اسیدوں اور آرزوں کا مرکز بن جائے گا۔ وہ سلطان ٹیپو کو اپنا سجات و پڑ  
سمجھ کر اس کے اشاروں پر جان دینا اپنے لیے باعثِ سعادت خیال  
کریں گے لیکن اگر ذلت اور رسوائی ان کے لیے مقدم ہو چکی ہے تو نہیں  
عزت اور سربلندی کا راستہ دکھانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔  
ہماری رگوں کو یہ اطمینان ہوگا کہ ہم خدا کی زمین پر اپنا آخری فرض ادا  
کر چکے ہیں اور جہادِ سزا کے مالک کے دربار میں کھڑے ہو کر ہم کسی  
دن یہ کہہ سکیں گے کہ جب قوم گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی  
تو ہم نے اسے روشنی دکھانے کی کوشش کی تھی۔ جب حق و باطل کا  
سعر گرم تھا تو ہم باطل کی بجائے حق کا ساتھ دینے والوں میں  
تھے اور جب قدرت نے ایک گرتی ہوئی قوم کو سنبھال دینے کے  
لیے ایک رحلِ عظیم کو بھیجا تھا تو ہم نے قوم کے دامن سے ذلت  
اور رسوائی کا داغ دھونے کے لیے اپنا خون پیش کیا تھا۔  
رفیقہ حیات! میں دعا کرتا ہوں کہ صدیق اور مسعود کی طرح  
اؤر اور مراد بھی ہمیشہ سلطان ٹیپو کے جانشینوں کی صفِ اول میں  
نظر آئیں۔ ایک زمانہ تھا جب میں صرف جنگ اور اس کے نتائج  
کے متعلق سوچ سکتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ جب جنگ میں کسی فرقے

جائے گی اور اس کا ہر قدم کامیابیوں اور کامیابیوں کی طرف ہوگا۔ لیکن ان کامیابیوں اور کامیابیوں میں وہ لوگ برابر کے حصے دار سمجھے جائیں گے جنہوں نے ماضی کے جھیاٹک طوفانوں میں حق و انصافیت کا یہ پرچم بلند رکھا تھا۔ قیامت کے دن مختلف ادوار میں حق و انصافیت کے لیے قربانیاں دینے والے لوگ ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے اور میری آخری دعا یہ ہے، کہ یوسف، آصف، افضل، میرے آباجان اور صدیق اور مسعود کی طرح انور اور مراد بھی حق پرستوں کی اسی صف میں کھڑے ہوں:

تمہارا شوہر

جب فرحت خط پڑھنے میں مہینک تھی تو انور اور مراد کمرے میں داخل ہوئے اس کے سامنے کھڑے ہو گئے لیکن اسے اپنے گروہ پیش کا احساس نہ تھا۔ کبھی بھی خط کے الفاظ اور اس کی آنکھوں کے درمیان آنسوؤں کے پردے حال ہو جاتے وہ آنسو پختی اور دوبارہ خط پڑھنے میں مصروف ہو جاتی۔ خط ختم کرنے کے بعد وہ دیر تک سر جھمکائے بیٹھی رہی۔ بالآخر اس نے گردن اٹھائی اور اپنے بیٹوں کی طرف دیکھ کر کہا: تمہارے آباجان مرے نہیں، وہ زندہ ہیں۔ وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اس دنیا میں عزت اور آزادی کا تصور زندہ ہے۔ یہ خط تمہاری میراث ہے اور کوئی باپ اپنی اولاد کے لیے اس سے بہتر میراث نہیں چھوڑ سکتا۔

ایک ہفتہ بعد انزل محاذ جنگ کی طرف روانہ ہو چکا تھا اور اس کے بعد مراد علی مراد مکتب سے واپس آ کر اپنی ماں کو سلطان کی فتوحات کی نئی نئی خبریں سنایا کرتا۔

تھا۔ امی جان! بڈو فتح ہو چکا ہے۔ جنرل مہیوز اور اس کی فوج کو پارہ زخمی کر کے قید خانے کی طرف لایا جا رہا ہے۔ امی جان! آج خبر آئی ہے کہ سلطان کی اوزار منگور کی طرف بڑھ رہا ہیں۔ آج یہ خبر آئی ہے کہ منگور کا شہر فتح ہو چکا ہے اور قلعے کا محاصرہ جاری ہے۔ پھر ایک دن وہ بھاگتا ہوا آیا اور بلند آواز میں چلایا۔ امی جان! منگور کا قلعہ فتح ہو چکا ہے:

**Get more e-books from [www.ketabton.com](http://www.ketabton.com)  
Ketabton.com: The Digital Library**